سید ابوالاعلیٰ مودودی

اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور پاکستان

نام کتاب: مسئلہ جبر و قدر

مصنف: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اشاعت: ایڈیشن تعداد

ا۔ تا ۱۸ا۔ اگست ۱۹۹۷ء ۲۰٬۰۰۰

۱۹ا۔ مئی ۲۰۰۰ء ۱۱۰۰

اہتمام: پروفیسر محمد امین جاوید (مینجنگ ڈائریکٹر)

ناشر: اسلامک پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

۱۳ا۔ای' شاہ عالم مارکیٹ' لاہور (پاکستان)

فون: 7664504-7669546 فیکس: 7658674

ای میل islamic@ms.net.pk.

مطبع: انجینیئرز پرنٹرز' لاہور

قیمت: -/32 روپے

عرضِ ناشر

مسئلہ جبر و قدر فلاسفہ کا ہمیشہ سے محبوب و معرکہ آرا موضوع رہا ہے اور زمانۂ قدیم سے آج تک اس موضوع پر جتنی طبع آزمائی کی گئی ہے، شاید ہی کسی دوسرے موضوع پر کی گئی ہو لیکن بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اس مسئلہ کی حقیقت پالی ہو۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے قدیم و جدید فلاسفہ کا مکمل تجزیہ کرکے خالص اسلامی نقطہ نظر پیش کیا ہے اور اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں اس عقدہ کی گرہ کشائی کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں ایک طرف مولانا موصوف کے تبحر علمی کا اندازہ ہوگا وہیں دوسری طرف اس کو ایک معیاری کتاب بھی پائیں گے ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب بہت سے الجھے ہوئے ذہنوں کو صاف کرنے میں نہایت مفید ثابت ہوگی۔

اس سے قبل اس کتاب کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اب یہ پانچواں ایڈیشن پیش خدمت ہے۔ سابق ایڈیشنوں میں ناشرین کے سہو یا کسی اور سبب سے مولانا ممدوح کی نشری تقریر جو آل انڈیا ریڈیو سے ۱۹۴۲ء میں نشر ہوئی تھی شامل ہونے سے رہ گئی تھی اب اس کتاب میں شامل کر لی گئی ہے ہماری درخواست پر مولانا موصوف نے اس پر نظر ثانی بھی کر لی ہے۔ اب یہ کتاب ہر حیثیت سے

مکمل ہو گئی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے قارئین ہماری اس پیشکش کو اس ہی گرمجوشی کے ساتھ قبول فرمائیں گے جو مولانا موصوف کی دوسری تالیفات کے لیے مخصوص رہی ہے۔

لاہور

۲۹ ر رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ

مطابق ۹ ر فروری ۱۹۶۳ء

فہرست مضامین

عرض ناشر	[illegible]
مقدمہ	۷
مسئلہ جبر و قدر کی حقیقت	۱۷
اختیار و اضطرار کا ابتدائی اثر	۱۷
مسئلہ جبر و قدر کا نقطہ آغاز	۱۹
مابعد الطبیعی نقطہ نظر	۲۱
فلسفہ کی ناکامی	۲۷
طبیعی نقطہ نظر	۳۰
سائنس کی ناکامی	۳۴
اخلاقی نقطہ نظر	۳۷
اخلاقیات کی ناکامی	۴۳
دینیاتی نقطہ نظر	۴۴
صحیح اسلامی مسلک	۴۵
متکلمین اسلام کے مذاہب	۴۸
مذہب قدر	۴۸
قرآن مجید سے قدریہ کا استدلال	۵۵

مذہب جبر ۵۹
قرآن مجید سے جبریہ کا استدلال ۶۲
متکلمین کی ناکامی ۶۵
تحقیق مسئلہ ۷۳
امور ماوراء طبیعت کے بیان سے قرآن کا اصل مقصد ۷۵
مسئلہ قضا و قدر کے بیان کا منشاء ۷۷
عقیدۂ تقدیر کا فائدہ عملی زندگی میں ۸۳
تناقض کی تحقیق ۸۵
حقیقت کی پردہ کشائی ۱۰۰
مخلوقات میں انسان کی امتیازی حیثیت ۱۰۱
ہدایت و ضلالت ۱۰۵
عدل اور جزا و سزا ۱۰۹
جبر و قدر ۱۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

اس مختصر رسالہ کی تقریب یہ ہے کہ ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۳ء) میں جب میں نے ترجمان القرآن نیا نیا جاری کیا تھا، ایک صاحب نے مجھے ایک طویل خط لکھا جس میں اس پیچیدگی کو حل کرنے کی درخواست کی گئی تھی، جو قرآن کا مطالعہ کرنے والے کو جبر و قدر کے مسئلہ میں پیش آتی ہے[1]۔ کیونکہ بعض آیات اس کے سامنے ایسی آتی ہیں جن سے جبریت کا مفہوم نکلتا ہے اور دوسری آیات صریح طور پر قدریت کی تائید کرتی ہیں اور بظاہر ان دونوں قسم کی آیتوں میں ایسا تناقض محسوس ہوتا ہے جسے آسانی کے ساتھ رفع نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے اس خط کو بجنسہٖ رسالہ میں شائع کر دیا اور اس کے جواب میں ایک مفصل مضمون لکھا۔ یہی سوال اور اس کا جواب اس وقت کتابی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

وہ خط یہ تھا :-

" انسان کا مکلف بہ جزا و سزا ہونا ہی اس بات کا مقتضی ہے کہ اعمال و افعال اس کے ارادہ و نیت کے تابع ہوں اور اس ارادہ و نیت پر کسی اور طاقت کا تصرف نہ ہو۔ قرآن حکیم کی ساری تعلیم

---

[1] تاریخی دلچسپی کی خاطر یہ بات ظاہر کرنے میں مضائقہ نہیں کہ یہ صاحب چودھری غلام احمد صاحب پرویز تھے۔

کالب لباب یہی ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار قرار دے کر باز پرس کا مستوجب ٹھہرایا جاتے ۔ ضلالت و ہدایت عذاب و ثواب، نکبت و ثروت، مصیبت و راحت، غرضیکہ دنیا و آخرت کی میزان کے دونوں پلڑے قدرتی نتائج ہوں، ان کے اپنے اعمال کے، اور یہ نتائج مرتب ہوں کسی خاص قاعدہ کلیہ کے ماتحت لیکن قرآن مجید کی بعض آیات سے ایسا بھی پایا جاتا ہے کہ انسانی ارادہ خود مشیت ایزدی کا تابع ہے۔

مثلاً ضلالت و ہدایت کے متعلق ایک طرف تو ایسی کھلی اور واضح آیات موجود ہیں جن سے نور و ظلمت، ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت کی راہوں کا اختیار کرنا انسان کے اپنے ارادوں اور مساعی کے ماتحت قرار دیا گیا ہے۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (الدھر: ۳)

ہم نے اس کو راستہ دکھلا دیا ہے، چاہے تو شکر گزار رہے، اور چاہے تو ناشکر گزار بن کر رہے۔

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (البلد: ۱۰)

ہم نے اسکو دونوں راستے دکھا دیئے ہیں

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت: ۶۹)

جو لوگ ہمارے معاملے میں جدوجہد اور کوشش سے کام لیتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے دکھاتے ہیں۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف: ۲۹)

جو کوئی چاہے ایمان لے آئے اور جو کوئی چاہے ایمان نہ لائے۔

دوسری طرف ایسی آیات بھی ہیں جن میں ان چیزوں کو مشیت ایزدی کے تابع بتایا گیا ہے مثلاً

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (ابراہیم: ۴)

پس اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کسی کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے۔

مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (انعام: ۱۱۱)

وہ ہرگز ایمان لانے والے نہ تھے الّا یہ کہ اللہ چاہتا۔

سورۃ مدثر میں جہاں فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿۵۵﴾ (المدثر-۵۵)

(جو کوئی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے)

اور سورۃ تکویر میں

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾ (التکویر: ۲۸)

"یہ ایک نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لئے تم میں سے ہر ایک شخص کے لیے جو سیدھا چلنا چاہے"

کہہ کر قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے انسانی ارادہ کو اختیار دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آیات

وَمَا يَذْكُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

"نصیحت حاصل کر ہی نہیں سکتے اگر اللہ نہ چاہے"

وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللهُ ۔

"تم کیا چاہتے ہو، اگر اللہ نہ چاہے"

کہہ کر اس ارادہ کو مشیت باری تعالیٰ کے ماتحت قرار دیا اور سلب کر دیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اکثر جگہ گمراہی کے لئے یہ اصول عام کر دیا گیا ہے۔ کہ

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ط (البقرہ : ۲۶)

"وہ اس قرآن کے ذریعہ سے صرف بدکاروں کو گمراہ کرتا ہے"

وَيُضِلُّ اللهُ الظَّالِمِينَ (ابراهیم : ۲۷)

"اور اللہ حد سے گزرنے والوں کو گمراہ کر دیتا ہے"

بَلْ طَبَعَ اللهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ (النساء : ۵۵)

بلکہ اللہ نے ان پر ان کے انکار کی وجہ سے مہریں لگا دیں"

صَرَفَ اللهُ قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ (التوبہ ۱۲۷)

اللہ نے ان کے دلوں کو پلٹ دیا کیونکہ وہ ایسے لوگ تھے جو نہ سمجھتے تھے"

وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُونَ ط (التوبہ : ۱۱۵)

"اور اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد اسے گمراہ کرے، جب تک کہ اس کو یہ ہدایت دے کہ انہیں کس بات سے بچنا چاہیئے"

اور ہدایت کے لیے بھی ایسی شرائط بیان فرما دی ہیں :-

يَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ (الرعد : ۲۷)

"جو کوئی اس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ اس کو اپنی طرف ہدایت دیتا ہے"

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت: ۶۹)

"جو لوگ ہماری راہ میں جد و جہد اور کوشش سے کام لیتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے راستے دکھاتے ہیں"

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد: ۱۷)

"جو لوگ ہدایت قبول کرتے ہیں اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے"

اور اسی قبیل سے اور متعدد آیات قرآنی ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی ایسی آیات بھی ہیں جن میں بغیر کسی شرط و قید کے ضلالت و گمراہی کو مشیت باری تعالےٰ یا فضل ایزدی کے تابع رکھا گیا ہے۔ مثلاً آیت محولہ صدر

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ط

"جس کو اللہ چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے" اور

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ط

"تم کیا چاہتے ہو اگر اللہ نہ چاہے"

اسی طرح عذاب و مغفرت کے بارے میں جہاں ایک طرف صاف و بیّن اصول مقرر فرمایا ہے کہ :-

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ط (الزلزال - ۷)

"جو کوئی ذرہ بھر نیکی کرے گا وہ اس کا نیک اجر دیکھ لے گا"

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۔ (البقرہ۔ ۲۸۶)

"جو کچھ نیکی اس نے کمائی اس کا فائدہ اس کے لئے ہے اور جو بدی اس نے سمیٹی اس کا وبال اس پر ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَیْہَا (الجاثیہ: ۱۵)

"جو کوئی نیک کام کریگا اس کا وہی فائدہ اٹھائیگا اور جو کوئی برا کام کرے گا اس کی سزا وہی بھگتے گا"

دوسری طرف یہ بھی قرآن حکیم میں ہے کہ:۔

یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ (آل عمران - ۱۲۹)

"جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے سزا دے"

یعنی عذاب و مغفرت بھی مشیت ایزدی کے تابع ہیں ، مغفرت میں تو خیر کہا جا سکتا ہے کہ وہ ارحم الراحمین ، غافر الذنب اپنی شان کریمی سے گنہگار کو بخش دے گا ، لیکن یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ کی یہ تاویل مشکل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ معنی لیئے جا سکتے ہیں کہ گنہگاروں میں سے یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ لیکن پوری آیت کا قرینہ اسکی طرف قوی دلالت نہیں کرتا۔

نکبت و ثروت کے لیے بھی قرآن حکیم میں اقوام گذشتہ کی تاریخی شہادتوں سے اصول کی تائید کی گئی ہے کہ جاہ و اقبال ورا اصل ایمان و تقویٰ ، پاکباز زندگی ، اعمال صالح اور قانون فطرت کی پابندی کے ساتھ لازم و ملزوم ہے اور اس کے خلاف چلنے سے ذلت و شکست ، غضب الٰہی کی شکل میں طاری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (المائدہ - ۶۶)

"اور اگر وہ تورات اور انجیل پر اور ان تعلیمات پر قائم رہتے جو ان کی طرف ان کے رب کی جانب سے نازل کی گئی تھیں تو وہ اوپر سے اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھانے کا سامان پاتے"

یا او متعدد آیات لیکن دوسری طرف یہ آیات بھی قرآن شریف میں ہیں۔

وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (البقرۃ - ۲۱۲)

"اللہ جس کسی کو چاہتا ہے بے حساب دے دیتا ہے"

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ (آل عمران - ۲۶)

اللہ جس کسی کے لئے چاہتا ہے روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کسی کے لئے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔

تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (آل عمران - ۲۶)

جس کسی کو تو چاہتا ہے غالب کر دیتا ہے اور جس کسی کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے"

مصیبت اور راحت کے باب میں بھی کھلا کھلا فیصلہ ہے کہ :-

مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ (الشوریٰ ۳۰)

"تمہیں جو کچھ بھی مصیبت پہنچتی ہے اپنے ہی ہاتھ سے پہنچتی ہے"

لیکن دوسری طرف یہ آیت بھی ہمارے سامنے ہے کہ :-

"وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (النساء - ۷۸)

"اور اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے اور اگر کوئی نقصان ہو جائے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے ان کو بتا دے کہ نفع و نقصان جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔"

لیکن كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے ساتھ ہی دوسری آیت میں ہے کہ:-

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (النساء-۷۹)

"ہر بھلائی جو تمہیں حاصل ہوتی ہے اللہ کی جانب سے ہوتی ہے اور ہر برائی جو تمہیں پیش آتی ہے وہ تمہاری اپنی وجہ سے ہوتی ہے۔"

قرآن حکیم کے بعد اگر ہم احادیث کی طرف آئیں تو بہت سی احادیث انسان کے مجبور و مقہور ہونے پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً:-

اِذَا سَمِعْتُمْ بِجَبَلٍ زَالَ عَنْ مَكَانِهٖ فَصَدِّقُوْا بِهٖ وَ اِذَا سَمِعْتُمْ بِرَجُلٍ تَغَيَّرَ عَنْ خُلُقِهٖ فَلَا تُصَدِّقُوْا بِهٖ فَاِنَّهٗ يَصِيْرُ عَلٰى مَا جُبِلَ عَلَيْهِ۔

"جب تم سنو کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو اس کی تصدیق کر سکتے ہو لیکن اگر سنو کہ ایک شخص اپنی طینت سے ہٹ گیا تو اس کی ہرگز تصدیق نہ کرنا، کیونکہ آدمی ویسا ہی ہو کر رہتا ہے جیسا اس کا خمیر ہے)

اِنَّ الْقُلُوْبَ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ اللّٰهِ يُقَلِّبُهَا كَيْفَ يَشَآءُ

"دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، جس طرح چاہتا ہے انہیں پھیر دیتا ہے"

یا ایک حدیث شریف میں ہے کہ

"لوگ میں پیدا کئے گئے ہیں ان میں سے بعض مسلمان پیدا کئے گئے ہیں"... الخ

میں نے اعتراضات مختصراً لیکن من وعن پیش کر دیئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تقدیر کا مسئلہ بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا دنیا میں مذہب کا وجود اور ہے بھی کچھ لاینحل سا ہی۔ ہر ایک مذہب نے اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا ہے لیکن افراط وتفریط کرکے ہندوستان و یونان میں تو تناسخ کے چکر اور جبر کیا ہے انسان کو گویا مجبور محض بنا دیا گیا ہے تو ایران کے آتشکدوں میں خدا کو بھی معطل محض بنا دیا گیا ہے حکمائے مغرب کے ایک فرقے نے اگر خدائے خالق کو ایک گھڑی ساز کی طرح سمجھا کہ جو ایک دفعہ گھڑی بنا دینے کے بعد اسے اصول اور قاعدے کے تحت چھوڑ کر خود دعلینو معطل ہو جاتا ہے تو ہمارے ہاں کے جبریہ و قدریہ کی بحثیں بھی کم متشدد نہیں ہیں۔ یہ درست ہے کہ نظری لحاظ سے اس باب میں ایمان وعقل کے دونوں پلڑوں میں توازن مشکل ہو جاتا ہے لیکن اسے کھٹا ٹھو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ ہر چند میرے نزدیک مسئلہ قضا و قدر جزو ایمان نہیں ہے اور اس کی حیثیت ایک مسئلہ کی ہے لیکن چونکہ قرآنی آیات میں بقول معترضین بظاہر تضاد نظر آتا ہے اس لیے اس مسئلہ پر غور کرنا ضروری ہے۔

مسئلہ ہر چند بہت پرانا ہے اور اس پر مخالف و موافق بہت کچھ لکھا ہوا ہمارے پاس موجود ہے لیکن چونکہ

اس دور میں سے اور ہے جام اور ہے جم اور

اس لئے دورِ حاضر کے طرزِ استدلال و استنباطِ نتائج کے مطابق اس کے متعلق بھی گفتگو کی جانی ضروری ہے"۔

اگرچہ یہ رسالہ ابتداءً اسی خط کے جواب میں لکھا گیا تھا اور اس کے لکھنے کا اصل مقصد اس تعارض کو رفع کرنا تھا جو قرآن مجید کی بعض آیات کے درمیان بظاہر نظر آتا ہے۔ لیکن اس کے ضمن میں جو مسائل زیرِ بحث آ گئے ہیں وہ مسئلہ جبر و قدر کی اس گتھی کو سلجھانے میں ان تمام لوگوں کو مدد دے سکتے ہیں جو فلسفہ، اخلاقیات، عمرانیات اور دوسرے شعبہ ہائے علم میں اس گتھی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسی فائدے کو ملحوظ رکھ کر اس رسالے کو اب کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ آخر میں اپنے ایک اور مضمون کو بھی میں نے اس کے ساتھ ضمیمہ کے طور پر لگا دیا ہے جس سے اسی مسئلے کی مزید توضیح ہوتی ہے۔

ابوالاعلیٰ

مسئلہ جبر و قدر کی حقیقت

جہاں تک پیش کردہ سوال کا تعلق ہے اس کے جواب میں تو صرف اسی قدر کافی ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید کی آیات میں وجہ تطبیق بیان کر کے اس تناقض کو رفع کر دیا جائے جو بظاہر ان میں نظر آتا ہے لیکن اس وجہ تطبیق کے بیان میں بہت سے ایسے امور کی طرف اشارہ ناگزیر ہے جن کو ذرا تفصیل و تشریح کے ساتھ ذہن نشین کئے بغیر مدعا کو سمجھنا بہت مشکل ہوگا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کے ارشادات پر بحث کرنے سے پہلے مسئلہ جبر و قدر کی اصلیت اور اس کے مالہ و ماعلیہ پر نظر ڈال لی جائے۔

اختیار و اضطرار کا ابتدائی اثر

ہر شخص بلا کسی غور و فکر کے محض وجدانی طور پر یہ تصور رکھتا ہے کہ انسان اپنی ارادی حرکات و سکنات میں آزاد ہے اور جو فعل وہ اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے اس کے لیے وہ ذمہ دار و جواب دہ ہے، اچھے افعال و کردار کے لیے مدح و تحسین اور جزا و انعام کا مستحق ہے اور برے افعال کے لیے ملامت اور سزا کا مستوجب۔ اس سادہ اور وجدانی تصور میں کہیں اس

خیال کا شائبہ نہیں ہوتا کہ آدمی اپنے سوچے سمجھے افعال میں کسی خارجی یا باطنی قوت سے مجبور بھی ہوتا ہے جہاں فی الواقع مقہوری و مجبوری کے آثار نظر آتے ہیں وہاں ارادہ و اختیار کے بجائے اضطرار و بے اختیاری کا حکم لگایا جاتا ہے۔ انسان کی ذمہ داری و جوابدہی ختم ہو جاتی ہے، مدح و ذم اور سزا و جزا کا استحقاق باقی نہیں رہتا، اور ایسے حالات کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ ان پر انسان کے نیک یا بد اور اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔ اگر کوئی شخص کسی کو پتھر مارے یا گالی دے تو اس کے دل میں یہ خیال تک نہیں آتا کہ اس شخص نے یہ فعل کسی اور طاقت کے جبر سے کیا ہے، اور اسی لیے وہ اس کو ذمہ دار قرار دے کر جواب میں گالی یا پتھر سے اس کی تواضع کرتا ہے لیکن اگر وہی شخص دیوانہ ہو تو اس کی گالی یا پتھر کو کوئی بھی قصد و اختیار پر محمول نہیں کرتا بلکہ اسے مجبور و مضطر قرار دے کر تمام افعال کی ذمہ داری سے بری سمجھتا ہے۔

یہی اضطراری و اختیاری، ارادی و تسخیری اعمال کا فرق، جس کا تصور پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے، اس معیار کی بنیاد ہے جو ہم نے انسان کے نیک اور بد ہونے اور اس کے قابل جزا یا مستوجب سزا ہونے کے لیے قائم کیا ہے۔ ہم ایک بچے یا ایک پاگل کو اس کے برہنہ پھرنے پر کبھی ملامت نہیں کرتے مگر ایک عاقل و بالغ آدمی بحالت عریانی باہر نکل آئے تو اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کسی شخص کا منہ قدرتی طور پر خراب ہو تو کوئی اسے دیکھ کر برا نہیں مانتا لیکن اچھے خاصے منہ والا ہمیں دیکھ کر منہ چڑائے تو ہمیں

ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ بخار کا مریض حالتِ بحران میں لایعنی باتیں بکتا ہے اور ہم اسے کچھ الزام نہیں دیتے ہمگر عالمِ ہوش میں کوئی شخص ایسی باتیں کرے تو اس پر ملامت کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔ اندھا آدمی اپنی چیز کے بجائے کسی دوسرے کی چیز اٹھا لے تو ہم اس پر چوری کا الزام نہیں لگاتے۔ مگر آنکھوں والا یہی حرکت کرے تو اسے فوراً پکڑ لیتے ہیں۔ کوئی شخص کسی دباؤ کے تحت نیکی کرے تو اس کی تعریف نہیں کی جاتی مگر بغیر کسی دباؤ کے نیک عمل کرنے والے کی سب تعریف کرتے ہیں۔ بچہ اگر گناہ نہیں کرتا تو اس کو نیک نہیں کہا جاتا، البتہ جوان آدمی کے عمل صالح پر نیکی کا حکم لگایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ ظاہر حالات کو دیکھتے ہوئے ہم پہلے سے یہ سمجھتے ہیں کہ انسان بعض افعال میں مختار ہے اور بعض میں مجبور، اور پھر وجدانی طور پر ہم یہ رائے رکھتے ہیں کہ ذمہ داری و جواب دہی اور اسکی بنیاد پر مدح و ذم اور سزا و جزا کا استحقاق کلیتہً اختیاری افعال پر مترتب ہوتا ہے، نہ کہ اضطراری افعال پر۔

مسئلہ جبر و قدر کا نقطہ آغاز

لیکن جب انسان غور و فکر کر کے ظواہر اشیاء کی تہ میں پوشیدہ حقائق کا پتہ چلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر منکشف ہوتا ہے کہ ظاہر بیں وہ اپنے آپ کو جتنا قادر و مختار سمجھتا ہے اتنا نہیں ہے اور سطحی نظر سے وہ اپنی مجبوری اور اپنے اضطرار کے لیے جو حدود مقرر کرتا ہے حقیقت میں وہ بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی نقطہ ہے جہاں سے مسئلہ جبر و قدر کا آغاز ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی

بنیاد جن سوالات پر ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) کیا انسان اپنے اعمال میں بالکل مجبور ہے یا کسی حد تک اس کو آزادی بھی حاصل ہے ؟

(۲) انسان کو مجبور کرنے والی یا اس کی آزادی کو پابند کرنے والی طاقت کون سی ہے اور اس کے اثرات انسان کی زندگی میں کس حد تک ہیں ؟

(۳) اگر انسان پابند یا مجبور ہے تو اعمال کی ذمہ داری و جواب دہی اور ان پر مدح و ذم یا جزا و سزا کے استحقاق کا قاعدہ ، جس پر ہمارے اخلاقی تصورات مبنی ہیں اور جو ہمارے نظام اجتماعی کی صلاح و فلاح کا ضامن ہے ، کس اساس پر قائم ہوگا ؟

دنیا کے ارباب فکر نے ان سوالات پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے نگاہ ڈالی ہے ۔ ان کے حل کے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں ، اور مختلف دلائل و شواہد کی بنا پر مختلف نظریے قائم کر لئے ہیں ۔ اس باب میں اہل علم و تحقیق کے مقالات اور ان کے اختلافات اتنے کثیر ہیں کہ ان سب کا احاطہ مشکل ہے لیکن اصولی حیثیت سے ہم ان سب کو چار قسموں پر تقسیم کرتے ہیں ۔

(۱) وہ جنہوں نے مابعد الطبیعی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے (۲) وہ جنہوں نے طبیعی نقطۂ نظر اختیار کیا ہے (۳) وہ جنہوں نے اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کو دیکھا ہے ۔ (۴) وہ جنہوں نے دینی نقطۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالی ہے ۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ ان مختلف پہلوؤں سے مختلف گروہوں نے کس طرح اس مسئلہ پر غور کیا ہے ، بحث و استدلال کی کون سی راہیں اختیار کی ہیں اور آخر میں کن نتائج پر پہنچے ہیں ۔

مابعد الطبیعی نقطۂ نظر

مابعد الطبیعات (Metaphysics) میں جبر وقدر کا مسئلہ دو پہلوؤں سے آتا ہے :-

اوّل : قدرت سے مراد ہم یہ لیتے ہیں کہ فاعل ایک ایسی ہستی ہو جس سے فعل کا صدور اور عدم صدور دونوں صحیح ہوں یا بالفاظ دیگر وہ چاہے تو فعل کرے اور نہ چاہے تو نہ کرے۔ قدرت کی یہ تعریف مان لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترکِ فعل پر فعل کی ترجیح یا اس قدرت کا قوت سے فعل میں آنا کسی سبب سے ہوتا ہے یا بلا سبب، اگر بلا سبب ہو تو ترجیح بلا مرجح اور مسبّب بلا سبب لازم آتا ہے جو خلافِ عقل ہے۔ اور اگر اس کے لیے کسی مرجح یا سبب کا ہونا ضروری ہو تو وہ کون ہے ؟ جبریہ کہتے ہیں کہ وہ مرجح ایسے اسباب و داعیات ہیں جن کا رشتہ انسان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ایک بالاتر قوت کے بس میں ہے جسے چاہو خدا کہہ لو، چاہو علت العلل و مسبب الاسباب یا قانون فطرت وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرو، اور قدریہ کہتے ہیں کہ وہ انسان کا اپنا ارادہ ہے۔ جبریہ کے قول

سے لازم آتا ہے کہ خیر وشر دونوں کا مرجع خدا کی ذات ہو، کائنات میں انسان کی حیثیت محض جمادات ونباتات کی سی ہو اور انسان کی ذمہ داری بالکل ساقط ہو جائے۔ قدریہ کے قول سے لازم آتا ہے کہ انسان کا ارادہ خدا کے دائرہ خلق و ابداع سے خارج ہو اور کائنات میں خدا کے سوا ایک اور چیز بھی ایسی ثابت ہو جو غیر مخلوق ہے۔ کیوں کہ اگر انسان کے ارادہ کا خالق خدا نہیں ہے تو خود انسان بھی اس کا خالق نہیں ہے، اس لیے کہ انسان خود مخلوقِ خدا ہے لہٰذا مخلوق کے ارادہ کا غیر مخلوق ہونا لازم آتا ہے جو ایک نہایت ناقابلِ قبول بات ہے۔

دوم: دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ صانعِ کائنات کا علیم اور مرید[1] ہونا ضروری ہے کیونکہ اگر صانع کو اس چیز کا علم نہ ہو جس کو وہ بنانے والا ہے اور وہ اس کے بنانے کا ارادہ نہ کرے تو وہ صانع ہی نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدہ کی بنا پر یہ ماننا ضروری ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس سب کا خدا کو پہلے سے علم تھا اور اس کے پیش آنے کا خدا نے ارادہ کیا تھا۔ اب اگر خدا کو یہ علم تھا کہ فلاں شخص فلاں وقت فلاں فعل کرے گا تو اس فعل کا اس وقت اس شخص سے واقع ہونا واجب ہے، کیونکہ اگر وہ واقع نہ ہو تو خدا کا علم جہل ہو گا، اور یہ محال ہے۔ اسی طرح اگر خدا نے یہ ارادہ کیا تھا کہ فلاں وقت فلاں شخص سے فلاں حرکت سرزد ہو تو اس کا ارادہ پورا ہونا واجب ہے۔ ورنہ ارادۂ الٰہی کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔ اس استدلال سے جبریہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فعل

---

[1] ارادہ کرنے والا یا صاحبِ ارادہ

اختیاری بجز واجب الوجود کے کسی اور میں متحقق نہیں ہے، باقی جتنے مختار ہیں سب کے سب مضطر بصورتِ مختار ہیں۔ قدریہ کا اس پر بھی وہی اعتراض ہے کہ اس سے خدا کا فاعل خیر و شر ہونا لازم آتا ہے، انسان کی تمام برائیوں کی ذمہ داری خدا کی طرف راجع ہوتی ہے اور اس اعتبار سے انسان، حیوان، جمادات اور نباتات میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

لیکن جتنا یہ اعتراض وزنی ہے، اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ وہ اشکال وزنی ہے جو جبریہ نے علمِ الٰہی اور ارادۂ الٰہی کے بارے میں پیش کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ انسان کے اختیار کو نباہنا اور اس وجوب و لزوم سے جو خدا کے علیم و مرید ہونے کا منطقی نتیجہ ہے، انسان کی آزادی کو بچا لے جانا نہایت مشکل ہے۔ قدریہ نے اس اشکال سے بچنے کے لئے جو راہیں اختیار کی ہیں ان میں سے اکثر اس سے زیادہ شنیع الزامات کو مستلزم ہیں جو وہ جبریہ پر عائد کرتے ہیں۔ مثلاً ان میں سے بعض نے خدا کے علیم و مرید ہونے سے ہی انکار کر دیا ہے۔ بعض نے علم و ارادۂ الٰہی کو تسلیم کر لیا ہے مگر وہ اس کو جزئیات و تفصیلات سے متعلق نہیں کرتے بلکہ اجمال پر محمول کرتے ہیں[1]۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا نے جو قوتیں انسان کو عطا کیں ان سے وہ صرف خیر کا ارادہ رکھتا تھا اور اسے یہ علم نہ تھا کہ ان کا غلط استعمال کیا جائے گا۔ لیکن یہ ایسی ضعیف باتیں ہیں جن کے ابطال کے لیے کچھ زیادہ نظر و تامل کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ قوی دلیل جو جبریہ کے جواب میں قدریہ کی طرف سے پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے

---

[1] یعنی کہتے ہیں کہ خدا کو جزئیات کا علم نہیں ہے بلکہ وہ صرف کلیات کو جانتا ہے۔

کہ خدا کے علم سابق اور انسان کی آزادی میں بظاہر خواہ کتنی ہی منافات نظر آتی ہو لیکن حقیقت میں مستقبل کے کسی واقعہ کے متعلق کسی کے علم کی صحت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ علم ہی اُس واقعہ کی علت ہو۔ اگر ہم موسم کے متعلق کوئی حکم لگائیں کہ فلاں وقت بارش ہوگی اور یہ حکم صحیح نکلے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بارش کے متعلق ہمارا علم ہی بارش کی علت ہے۔ مگر یہ دلیل جتنی قوی نظر آتی ہے درحقیقت اتنی قوی نہیں ہے اس لیے کہ حقیقی علم سابق اور ظن وقیاس دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ظن وقیاس کی صحت کو مظنون کے وقوع میں بلاشبہ کوئی دخل نہیں ہے لیکن حقیقی علم سابق اور معلوم کے درمیان وجوب ولزوم کے تعلق کی نفی کرنا بہت مشکل ہے۔

اِن اصُولی اشکالات کے علاوہ متعدد فروعی اشکالات اور بھی ہیں جو مابعد الطبیعات میں جبریت اور قدریت دونوں کو پیش آتے ہیں لیکن دونوں کی مشکلات یکساں نہیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جبریت نے انسان سے ارادہ کی آزادی سلب کرکے اس شئے کی نفی کی ہے جس کا ثبوت ہم اپنے نفس میں اوّلی اور وجدانی طور پر پاتے ہیں مگر قدریت نے جو مذہب اختیار کیا ہے وہ تو اُس سے بھی زیادہ بُرا ہے کیونکہ وہ یا تو خدا سے علم وارادہ اور قدرت جیسی صفات کمالیہ کو سلب کرکے انسان کو اس سے متصف کرتی ہے، یا سرے سے خدا یا علت العلل یا صانع کائنات کے وجود ہی کا انکار کر دیتی ہے اور ان دونوں صورتوں میں بہت سے وہ محالات لازم آتے ہیں جن کا ارتکاب فلسفہ و منطق کے قانون میں اولیات و وجدانیات کے انکار سے بہت زیادہ شنیع

بلکہ اشنع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد الطبیعات کے حدود میں قدریت کو قدم جمانے کے لیے کوئی مضبوط بنیاد نہیں مل سکی ہے اور دہریوں کی ایک قلیل جماعت کو چھوڑ کر، فلاسفہ کی عظیم اکثریت نے جبر کا پہلو اختیار کیا ہے۔ قدماء میں انکسماندر (Aneximander) افلاطون، اور اکثر رواقیہ (Stoics) مذہب جبر کے حامی تھے۔ فلاسفۂ اسلام کی عظیم اکثریت نے بھی اس مذہب کی حمایت کی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا سب سے بڑا فلسفی ابن سینا تعلیقات شفا میں لکھتا ہے:-

> "عرف عام میں مختار سے مراد بالقوت مختار ہے اور بالقوت مختار ہمیشہ ایک مرجح کا محتاج ہوتا ہے جو اس کے اختیار کو قوت سے فعل میں لائے، عام اس سے کہ وہ مرجح خود اس کی اپنی ذات میں ہو یا اس سے خارج۔ اس بنا پر ہم میں جو مختار ہے وہ درحقیقت مضطر کے حکم میں ہے۔"

یہی حال یورپین فلاسفہ کا بھی ہے۔ پومپونیزی (Pomponazze) صریح حکم لگاتا ہے کہ خدا فاعلِ خیر و شر ہے اور عقل کلیتہً جبر کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہابز (Hobbes) کہتا ہے کہ انسان اپنی فطرت اور طبیعی داعیات کے ہاتھوں مجبور محض ہے۔ ڈیکارٹ (Descrate) جو نفس اور جسم یا روح و مادہ کی دوئی کا قائل ہے۔ مادی دنیا میں قانون جبر کے سوا کوئی قانون نہیں دیکھتا۔ اس کے نزدیک انسان سمیت تمام عالم ایک مشین کی طرح کام کر رہا ہے۔ اگرچہ اس کیساتھ ہی وہ نفس میں کامل خود اختیاری کی قوت کا اثبات بھی کرتا ہے مگر اسکے مذہب کا منطقی نتیجہ جبر ہی ہے۔ چنانچہ مذہب کارٹیزی (Cartesian School)

کے دوسرے اہم جن میں ملبیلز (Malebranche) سب سے زیادہ نمایاں ہے، صاف کہتے ہیں کہ نفس کے ہر ارادہ کے ساتھ خدا جسم میں حرکت پیدا کرتا ہے اور جسم کے ہر تہیج کے ساتھ نفس میں ادراک خلق کرتا ہے مادہ و روح یا امتداد و فکر کے درمیان خدا کا توسط لازمی ہے۔ کیونکہ ایک واسطہ کے بغیر ان دونوں مستقل جوہروں میں تعامل متصور نہیں ہو سکتا، لہذا خدا ہی تمام ارادات و حرکات کا حقیقی فاعل ہے۔ اسپائنوزا (Spinoza) کے نزدیک انسان اپنے اندر خواہ کتنی ہی فعلیت محسوس کرتا ہو مگر در اصل وہ فاعل نہیں بلکہ منفعل ہے۔ اس لیے وہ بالکل بے قدرت ہے۔ اس کے خیال میں یہی جبریت ایک فلسفی کے لیے مسرت و اطمینان قلب کا سرچشمہ ہے۔ لائب نتز (Leibnitz) کے آحاد یا ذوات Monads گرچہ بجائے خود آزاد ہیں۔ مگر ان میں توافق ازلی (Pre-Established Harmony) خدا کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس لیے وہ بھی آخر کار جبر ہی کی طرف آجاتا ہے۔ بلکہ اس کی جبریت کو ہم جبریت خالصہ کہہ سکتے ہیں لاک (Locke) آزادی ارادہ کو بے معنی، اور اس قدریت کو جس کے آثار ڈیکارٹ کے فلسفہ میں پائے جاتے ہیں، غلط قرار دیتا ہے۔ اگرچہ وہ صاف طور پر جبریت کا اقرار نہیں کرتا، مگر جب وہ کہتا ہے کہ ہم ارادہ کرنے یا نہ کرنے کے لیے آزاد نہیں ہیں اور یہ کہ ارادہ نفس سے متعین ہوتا ہے اور نفس خواہشات مسرت سے، تو اس کے فلسفے کا رُخ قدریت سے جبریت کی طرف پھر جاتا ہے۔ شاپنہار (Schopenhaure) جس ارادہ کو انسان سے لے کر جمادات تک سب چیزوں میں کارفرما دیکھتا ہے وہ ہرگز وہ ارادہ نہیں ہے

جس کی آزادی پر قدریت کی بنیاد قائم ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کانٹ (Kant فخشے Fischte) اور ہیگل (Hegel) جیسے اکابر فلسفہ نے قدریت کی طرف میلان ظاہر کیا ہے بقراط نے آزادی ارادہ کی حمایت کی ہے ، افلاطون نے انسان کے لیے اختیار ثابت کیا ہے ، ارسطو نے اختیاری اور اضطراری افعال میں تمیز کر کے انسان کو ایک حد تک آزاد اور ایک حد تک مجبور قرار دیا ہے ۔ خرسیپوس رواقی (Chrysippus) نے جبریت اور اخلاقی ذمہ داری میں توافق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور فلاسفۂ اسلام میں سے ایک گروہ نے لا جبر و لا تفویض ولکن امر بین الامرین کا مذہب اختیار کیا ہے مگر یہ سب کچھ حکمت نظری کی خاطر نہیں بلکہ حکمت عملی کی خاطر ہے ۔ ورنہ جہاں تک خالص مابعد الطبیعی نقطۂ نظر کا تعلق ہے ۔ اس کی رُو سے جبریت کا پلڑا قدریت کی بہ نسبت بہت زیادہ جھکا ہوا ہے ، اور فلاسفہ کا اختلاف زیادہ تر جبریت اور قدریت کے اختلاف کی طرف نہیں بلکہ جبریت خالصہ اور جبریت متوسط کے اختلاف کی طرف راجع ہوتا ہے ۔

فلسفہ کی ناکامی

لیکن اس بحث میں قدریت کی بہ نسبت جبریت کا پلڑا جھک جانے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ فلسفہ نے اس گتھی کو سلجھا لیا اور مسئلہ جبر کے حق میں طے ہو گیا بلکہ اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان جب زیادہ گہری نگاہ سے ملکوت

ارض و سماوات کو دیکھتا ہے اور اس مطالعہ کی مدد سے اس زبردست نظام کے چلانے والے کی صفات کا تصور کرتا ہے تو اکثر و بیشتر اس کے دل و دماغ پر ایسی دہشت طاری ہو جاتی ہے کہ اس کی نگاہ میں خود اپنی ہستی کی کوئی منزلت باقی نہیں رہتی، اور اس کی مدہوش عقل اس سے کہتی ہے کہ جس کی قدرت اس لامحدود کائنات کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے، جس کا ارادہ اتنی عظیم الشان سلطنت پر فرماں روائی کر رہا ہے، جس کا علم اس نظام وجود کے چھوٹے اور بڑے سب کل پرزوں اور ان کی حرکات و سکنات پر ازل سے لے کر ابد تک حاوی ہے، اس کے سامنے تو بالکل عاجز ہے، بے بس ہے، درماندہ ہے، تیری قدرت، تیرا علم، تیرا ارادہ کوئی چیز نہیں۔

اس سے بڑھ کر اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ فلسفہ نے قضا و قدر کے مسئلہ کو سمجھ لیا ہے تو وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ قضا و قدر کا سوال حقیقت میں یہ سوال ہے کہ خداوند عالم کی سلطنت کا دستور اساسی کیا ہے؟ خدا کے علم اور اس کی معلومات، خدا کی قدرت اور اس کے مقدورات، خدا کے ارادہ اور اس کے مرادات کے درمیان کس قسم کا علاقہ ہے؟ خدا کا حکم کیا معنی رکھتا ہے؟ کس طرح وہ اس کی مخلوقات میں نافذ ہوتا ہے؟ مخلوقات کے مختلف مراتب میں اس کے احکام کی تنفیذ کن ضوابط کے تحت ہوتی ہے؟ اور موجودات عالم کی بے شمار انواع میں سے ہر نوع کس حیثیت سے اس کی تابع فرمان ہے؟ اب اگر کوئی شخص یہ دعوے کرتا ہے کہ اس نے ان سوالات کو حل کر لیا ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کا دعوے یہ ہے کہ اس نے خدا اور اس کی پوری خدائی کو ناپ

ڈالا ہے۔ یہاں تمام باتوں سے زیادہ شنیع بات ہے جن کا الزام قدریہ اور جبریہ ایک دوسرے پر عائد کرتے ہیں اور اگر ان کا دعوےٰ یہ نہیں ہے تو محض قیاس و استدلال کے بل بوتے پر وہ علم و یقین کے ایسے مرتبہ تک کیوں کر پہنچ سکتے ہیں، جہاں قطعیت کے ساتھ جبر یا قدر کا حکم لگانا ان کے لیے ممکن ہو؟

طبیعی نقطۂ نظر

طبیعیات میں یہ مسئلہ اس پہلو سے آتا ہے کہ تمام کائنات کی طرح انسان کے افعال بھی سلسلۂ اسباب سے وابستہ ہیں اور اس سے جو کچھ بھی صادر ہوتا ہے کسی سبب یا متعدد اسباب کے اثر سے ہوتا ہے۔ ایک فعل کے وجود میں آنے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے اگر وہ جمع نہ ہوں تو فعل کا وجود میں آنا ممتنع ہے اور اگر جمع ہو جائیں تو اس کا وجود میں آنا واجب ہے۔ ان دونوں صورتوں میں انسان مجبور محض ہے۔ اس لحاظ سے طبیعیات کا میلان ہمیشہ سے جبر ہی کی طرف رہا ہے۔ چنانچہ مادیئین کا ابوالآباء ڈیمقراطیس (Democritus) جیسے قدمائے طبیعین میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے، اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے صاف کہہ چکا ہے کہ عالم کی تمام اشیاء قانونِ فطرت میں جکڑی ہوئی ہیں۔

تاہم جب تک طبیعین نے نفس اور مادہ کے جوہری اختلافات سے انکار نہیں کیا تھا، اور جب تک وہ قوائے نفسیہ کو عالم مادہ سے کسی نہ کسی حد تک ماوراء سمجھتے تھے، اس وقت تک قدریت کے لیے طبیعیات میں کچھ نہ کچھ گنجائش

نکل سکتی تھی لیکن جب اٹھارھویں صدی کے آغاز سے علوم طبیعیہ نے غیر معمولی ترقی کی اور سائنس کی دنیا میں تحقیق و اکتشاف کے نئے نئے دروازے کھلنے لگے تو نفس اور روح اپنی تمام قوتوں سمیت ترکیب مادی اور مادہ کے کیمیاوی امتزاجات کا نتیجہ قرار دے دیئے گئے اور انسان ایک نفسانی و روحانی وجود کے بجائے محض ایک مشینی وجود رہ گیا۔ اس طرح طبیعیات کے حدود سے قدریت بیک بینی و دو گوش خارج کر دی گئی اور سائنس نے اپنا پورا وزن جبر کے پلڑے میں رکھ دیا۔

علم الحیات (Biology) اور علم وظائف الاعضاء (Physiology) کی جدید تحقیقات، جن کی بدولت علم النفس اب قریب قریب انہی دونوں علوم کی شاخ بن گیا ہے، یہ حکم لگا رہی ہیں کہ دماغ کی شکل اور اس کی ساخت اور جرم دماغی و نظام عصبی کی کیفیت ہی پر انسان کی فطرت اصلیہ کا مدار ہے۔ اسی کی خرابی سے انسان کی فطرت خراب ہوتی ہے اور اس سے برے رجحانات اور برے اعمال کا ظہور ہوتا ہے اور اسی کی بہتری سے اس کی فطرت اچھی ہوتی ہے اور وہ اچھے میلانات اور نیک اعمال کا مظہر و مصدر بنتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جرم دماغی اور نظام عصبی کی ساخت میں انسان کے آزاد ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے اس لیے اس مادی نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد یہ ماننا لازم ہو جاتا ہے کہ انسان کے اندر سرے سے آزادی کا کوئی عنصر ہے ہی نہیں۔ جس طرح لوہے کی مشین ایک لگے بندھے اصول پر کام کرتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی طبیعیات کے ایک زبردست قانون کے تحت کام کر رہا ہے۔ اخلاق کی زبان میں جس چیز

کو ہم نیکی اور حسنِ سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سائنس کی زبان میں وہ محض عناصر جسمانی کی ترکیب صحیح اور نظام عصبی کی درست حالت ہے۔ اخلاق جسے بدی اور بدچلنی سے تعبیر کرتا ہے، سائنس اس کو جرمِ دماغی اور نظام عصبی کا سقم قرار دیتا ہے۔ اس لحاظ سے نیکی اور صحت، بدی اور بیماری میں کوئی فرق نہیں رہتا، جس طرح ایک شخص اپنی اچھی صحت کے لیے مدح اور بیماری کے لیے ذم کا مستحق نہیں ہے۔ اسی طرح اپنی بدچلنی یا نیک چلنی کے لیے بھی بھی وہ مدح یا ذم کا مستحق نہ ہونا چاہیئے۔

اس کے ساتھ ایک دوسرا زبردست قانون جو جبریت کی تائید کرتا ہے، قانونِ توریث (Law of Heredity) ہے جس کی بنیادوں کو ڈارون اور رسل ویلیس (Russel Wallace) اور ان کے متبعین نے استوار کیا ہے۔ اس کی رُو سے ہر شخص کی فطرت و سیرت اسی سانچے میں ڈھلتی ہے۔ جو زمانہ ہائے ماسبق سے نسلاً بعد نسل چلا آرہا ہے اور یہ موروثی سانچہ جس شکل میں فطرت و سیرت کو ڈھالتا ہے اس کو بدل دینے پر کوئی شخص قادر نہیں ہے اس لحاظ سے آج ایک شخص سے جو برائی ظاہر ہوتی ہے وہ گویا ایک پھل ہے اس برے بیج کا جو اب سے سو برس پہلے اس کے پردادا نے بویا تھا، اور پردادا میں جو برائی تھی وہ بھی اس کو اپنی گذشتہ نسلوں سے ملی تھی۔ اس پھل کے ظہور و عدم میں اس شخص کے ارادہ و اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسی طرح اس کے اظہار پر مجبور ہے جس طرح ایک آم کا درخت، جو ایک کھٹے آم کی گٹھلی سے اُگا ہے۔ کھٹے آم پیدا کرنے پر مجبور ہے۔

تاریخ کا نظریہ بھی جبریت کا مؤید ہے۔ اس کی رُو سے اسبابِ خارجی کی تاثیرات مجموعی حیثیت سے اُس پوری انسانی جماعت کی فطرت و سیرت کو متاثر کرتی ہیں جو ان اسباب کے تحت رہتی ہو اور اسی بنا پر ایک مجموعۂ اسباب کے زیرِ اثر رہنے والی قوم کے خصائص کسی دوسرے مجموعۂ اسباب کے زیرِ اثر رہنے والی قوم کے خصائص سے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر ہم عمیق نگاہ سے دیکھیں تو دو قوموں کے اختلافِ مزاج اور اختلافِ سیرت کا مرجع ان اسبابِ خارجی کے اختلاف کو قرار دے سکتے ہیں جن کے تحت ان دونوں نے نشوونما پایا ہو۔ اسی طرح اگر ہم اسبابِ خارجی کی روشنی میں کسی قوم کے خصائص کو اچھی طرح سمجھ لیں تو پوری صحت کے ساتھ پیشگوئی کر سکتے ہیں کہ وہ کن حالات میں کیسی روش اختیار کرے گی۔ فرد کے شخصی ارادہ و اختیار کے لیے اس ہمہ گیر قانون کی مقرر کی ہوئی راہ سے انحراف کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگر افراد کی شخصی آزادی تسلیم کر لی جائے تو اس زبردست مشابہت کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی جو صدیوں تک ایک قوم کے اعمال و افعال میں دیکھی جاتی ہے، کیونکہ یہ کسی طرح تصور نہیں کیا جا سکتا کہ قوم کے تمام افراد نے متفق ہو کر بالارادہ ایک جیسے اعمال کرتے رہنے کا فیصلہ کیا ہو۔

اعداد و شمار کے فن نے بھی تجربی بنیاد پر جبر کی حمایت کی ہے۔ بڑی بڑی آبادیوں کے متعلق مختلف حالات میں جو اعداد و شمار فراہم کیے گئے ہیں انہیں جب ان خارجی اسباب کی روشنی میں دیکھا گیا جن کے تحت وہ حالات پیش آئے تھے تو معلوم ہوا کہ ہر جماعت میں مخصوص اسباب کے اثر سے

مخصوص حالات پیش آتے ہیں، اور ان حالات میں کثیر افراد کے اعمال بالکل ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے تجربات سے اب یہ علم اس حد تک ترقی کر چکا ہے کہ ایک ماہر فن ایک بڑی آبادی کے متعلق قریب قریب پوری صحت کے ساتھ یہ حکم لگا سکتا ہے کہ وہ فلاں قسم کے حالات میں فلاں عمل کرے گی۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر شہر لندن میں کتنی خودکشیاں ہونگی وہ کہہ سکتا ہے کہ ایک سال کے اندر شہر شکاگو میں کتنی چوریاں ہونگی۔ اگر ایک ملک میں دوسرے ملک کی بہ نسبت قتل کے اعداد و شمار کا تناسب زیادہ ہو تو قریب قریب صحت کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس کے معاشی یا عمرانی یا طبیعی اسباب یہ ہیں۔ ایک ملک یا ایک بڑی آبادی میں جس طرح اموات، پیدائش، جرائم اور دوسرے واقعات کا اوسط سالہا سال تک یکسانی کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور جس طرح اجتماعی حالات کے تغیر و تبدل سے ان اعداد و شمار میں اتار چڑھاؤ ہوا کرتا ہے۔ اس کی توجیہ بجز اس کے اور کسی چیز سے نہیں کی جا سکتی کہ اسباب خارجی کی تاثیرات بڑی بڑی آبادیوں پر اس ہمہ گیری اور اس قوت کے ساتھ عمل کرتی ہیں کہ افراد کے شخصی ارادے ان کے خلاف چل نہیں سکتے۔

سائنس کی ناکامی

اس مختصر بیان سے واضح ہو گیا کہ وہی سائنس جس پر انسان نے اپنے تفوق اور اپنے افتخار کی بنیاد رکھی ہے، کس طرح اس کی تمام فکری بلند پروازیوں اور تحقیق و اکتشاف کی متعدد کشائیوں کا سرمایۂ فخر و ناز اس سے چھین لیتا ہے

اور کس طرح انسان خود اپنے علم اور اپنی تحقیق کی بنا پر اپنے آپ کو نباتات و جمادات اور بے جان مشینوں کی طرح ایک مضطر و بے اختیار ہستی تسلیم کر لیتا ہے۔ مگر اس تسلیم و اعتراف کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ سائنس نے قضا و قدر کے مسئلے کو واقعی حل کر لیا ہے۔ برعکس اس کے اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ سائنس اس اختیار قدرت اور آزادی ارادہ کی کوئی توجیہہ نہیں کر سکا، جس کو وجدانی طور پر ہم اپنے اندر محسوس کرتے ہیں، جس کے آثار شب و روز ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں اور جس کی بنا پر ہم ارادی و اضطراری اعمال میں ہمیشہ فرق کیا کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود نفس، جس کے وجود پر انسان کا مختار اور صاحب ارادہ ہونا موقوف ہے، سائنس کی تحقیقات سے بالاتر ثابت ہوا ہے اور کوئی سائنٹیفک طریق تفتیش ابھی تک اس شے کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکا ہے جو انسان کے مادی وجود میں ایسے آثار و افعال اور اوصاف و خواص کا مبدا بنتی ہے جن کو کسی مادی ترکیب اور کسی کیمیاوی امتزاج کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال اگر طبیعت کا عالم یہ کہے کہ انسان کی سیرت میں اس کے نظام عصبی اور جرم دماغی کی ساخت کو بہت کچھ دخل حاصل ہے تو اس کو تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا یہ دعوی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ جسمانی خصائص، نفسانی خصائص کی واحد علت ہیں۔ اسی طرح اگر نظریۂ ارتقا کا پیرو یہ کہے کہ انسان اپنی بہت سی خصوصیات وراثۃً حاصل کرتا ہے تو اس کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں لیکن اگر وہ یہ کہے کہ انسان میں سب کچھ موروثی ہی ہے اور اس کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں تو دوسرے حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اس دعوی کو کسی طرح قبول نہیں

کر سکتے ۔ اسی طرح تاریخ اور اعداد و شمار کی بنا پر جو نظریہ قائم کیا گیا ہے
اس کی صحت بھی بس اسی حد تک ہے کہ شخص انسانی کو ایک بڑی حد تک اُن
خارجی تاثیرات نے مجبور کر رکھا ہے جو وسیع پیمانے پر قوموں اور جماعتوں
کو متاثر کرتی ہیں لیکن اس سے یہ ثابت کرنا ممکن نہیں ہے کہ اجتماعی احوال
کی گردش میں افراد کے شخصی ارادوں کو کسی قسم کی آزادی حاصل ہی نہیں ہے
اور اجتماعی زندگی کی مشین میں اشخاص محض بے جان کل پرزوں کی طرح حرکت
کر رہے ہیں ۔

پس علوم طبیعی اور ان کے توابع درحقیقت مسئلہ جبر و قدر کا تصفیہ نہیں کرتے
بلکہ ہم کو مشاہدات و تجربات کی بنا پر صرف یہ بتلاتے ہیں کہ ہماری زندگی میں جبر
کے حدود کہاں تک وسیع ہیں ۔

اخلاقی نقطۂ نظر

خالص اخلاقیات کے دائرے میں انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا سوال اس حیثیت سے نہیں آتا کہ ظاہری حالات کی تہ میں باطنی حقیقت کیا ہے، بلکہ یہاں اس پر اس نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے کہ انسان کی سیرت اور اس کے کردار پر حسن و قبح کا حکم اور اس کے اچھے اور برے رویّہ پر مدح و ذم کا استحقاق اور اس کے نیک و بد اعمال پر جزا و سزا کا فیصلہ کس بنیاد پر ہے۔ اوّل نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قدریہ کا پلہ بھاری ہے اور جبریت کی شکست یقینی، کیونکہ اگر انسان کو مجبور محض تسلیم کر لیا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ جو کچھ وہ کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار سے نہیں کرتا تو سرے سے اس کی ذمہ داری کا تصور ہی باطل ہو جاتا ہے، نیکی اور بدی بے معنی ہو جاتی ہے۔ اچھے اور برے کا کوئی مفہوم نہیں رہتا۔ نہ کوئی بڑے سے بڑا نیکوکار تعریف کا مستحق رہتا ہے اور نہ کوئی بدتر سے بدتر گنہگار مذمت کا۔ نہ کوئی اچھے سے اچھا خادمِ خلق انعام کا مستوجب رہتا ہے اور نہ سخت سے سخت مجرم سزا کا۔ ہماری عدالتیں ہمارے قوانین

ہماری پولیس، ہمارے جیل خانے، ہمارے مدرسے، ہماری اخلاقی تربیت گاہیں، ہمارے وعظ، ہماری تقریریں، ہماری تحریریں، غرض وہ تمام چیزیں جو انسان کو صاحبِ ارادہ اور صاحبِ اختیار فرض کر کے اصلاح تعزیر، عبرت اور موعظت کے لیے قائم کی گئی ہیں، قطعاً بیکار اور لاحاصل قرار پاتی ہیں۔

لیکن بحث و تحقیق کے میدان میں دو چار قدم آگے بڑھتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں جبریت اور قدریت کے اختلاف کا فیصلہ صرف اتنی سی بات پر نہیں ہو جاتا۔ اخلاقیات میں عمل کی قدر و قیمت، سیرت اور محرکاتِ عمل کی بنیاد پر جانچی جاتی ہے اور سیرت و محرکات کا سوال آتے ہی یہ ناگزیر ہو جاتا ہے کہ ان عناصر کی تحقیق کی جائے جن سے انسان کی سیرت بنتی ہے اور ان اندرونی عوامل کا پتہ چلایا جائے جو کہ کردار اور عمل کی صورت میں ظہور کرتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر بحث کا رُخ پھر طبیعیات، نفسیات اور مابعد طبیعیات کے مسائل کی طرف پھر جاتا ہے۔

قائلینِ جبر کہتے ہیں کہ انسان کی سیرت دو زبردست عنصروں سے بنی ہے۔ ایک فطرت اصلیہ جس کو لے کر وہ پیدا ہوتا ہے، دوسرے خارجی تاثرات جن سے وہ ہر لحظہ متاثر ہوتا ہے اور جن کے سانچے میں وہ ہر آن ڈھلتا رہتا ہے۔ پہلی چیز تو قطعاً وہبی ہے جس میں انسان کے اختیار کو دخل نہیں ہے۔ ایک شخص ماں کے پیٹ سے جو فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے، وہی اس کی سیرت کا مایۂ خمیر ہوتی ہے۔ بری فطرت سے اچھے

اعمال کا ظہور ممکن نہیں ہے اور اچھی فطرت سے بُرے اعمال کا ظہور بھی غیر ممکن ہے۔ رہیں خارجی تاثیرات جن میں طبیعی اور اجتماعی دونوں قسم کی تاثیریں شامل ہیں تو وہ فطرت کے اس اصلی مادّے کو پرورش کرتی ہیں اور اس کی قابلیت و استعداد کے مطابق اس کو ایک خاص شکل میں متشکل کر دیتی ہیں۔ ایک اچھی فطرت کا انسان اچھے ماحول میں ولی بن جاتا ہے اور بُری فطرت کا انسان بُرے ماحول میں شیطان۔ اسی طرح بُرا ماحول اچھی فطرت کی خوبیوں کو کم کر دیتا ہے اور اچھا ماحول بُری فطرت کی بُرائی کو گھٹا دیتا ہے۔ فطرت اور ماحول کا تعلق بالکل ایسا ہی ہے جیسے بیج کا تعلق زمین، پانی، آب و ہوا اور طریق باغبانی سے ہے درخت کا اصل مادہ بیج ہے اور ان خارجی اشیاء پر اس کے اچھی طرح یا بُری طرح بار آور ہونے کا انحصار ہے۔ یہی حال انسان کا بھی ہے۔ وہ ان دونوں قوتوں کے ہاتھوں مجبور ہے۔ نہ وہ اپنی فطرت بدل سکتا ہے، نہ اپنے انتخاب سے ایک خارجی ماحول کو اختیار کرتا ہے اور نہ ماحول کی تاثیرات سے متاثر ہونا یا نہ ہونا اس کے اختیار میں ہے۔

قدریہ میں سے انتہا پسند گروہ تو اس کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک فطرت اصلیہ اور ماحول کی تاثیرات کو اگر انسان کے کردار میں کوئی دخل ہے تو وہ صرف اضطراری اعمال کی حد تک ہے۔ رہے وہ اعمال جن کو انسان سوچ سمجھ کر، اپنی قوت تمیز اور قوت فیصلہ سے کام لے کر بالارادہ کرتا ہے تو ان میں دونوں کو کسی قسم کا دخل حاصل نہیں ہے، بلکہ وہ قطعاً اس کے اپنے اختیار کا نتیجہ ہیں۔ یہ خالص قدریت ہے جس کو بعض لوگوں نے

پیش کیا ہے۔ مگر اس نظریہ کو قبول کرنا بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ شعور، عقل و فہم، قوتِ تمیز اور قوتِ فیصلہ، جو آدمی کے اختیاری افعال کی بنیاد ہیں۔ خود ہی وہبی ہیں۔ نہ انسان نے اپنے کسب سے ان کو حاصل کیا ہے اور نہ وہ ان میں بال برابر کمی و بیشی کرنے پر قادر ہے۔ پھر ان قوتوں کے اثر سے وہ اپنے لئے عمل کی جو راہ بھی اختیار کرے اس کے متعلق کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے آزادانہ اختیار کا نتیجہ ہے۔

متوسطین قدریہ کا مذہب اس معاملہ میں یہ ہے کہ بلاشبہ انسان کی سیرت میں فطرتِ اصلیہ اور خارجی تاثیرات کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔ انسان اچھے اور برے میلانات اور نیکی و بدی کی استعدادات لے کر پیدا ہوتا ہے اور طبعی اور اجتماعی ماحول کے سانچے میں ڈھل کر اس کی سیرت ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری چیز بھی ہے جو اس کے کردار میں دخل رکھتی ہے اور وہ ہے انسان کا غیر مقدر اختیار۔ ہم انسان کی نیکی اور بدی کے متعلق جو احکام لگاتے ہیں وہ اس کی پیدائشی فطرت یا اس کے طبعی و اجتماعی ماحول کی بناء پر نہیں ہوتے، بلکہ اسی غیر مقدر اختیار کی بنا پر ہوتے ہیں۔ جہاں تک پہلی دونوں چیزوں کا تعلق ہے، ان کے لحاظ سے انسان مجبور ہے اور اس کے کردار کا جو حصہ اُن کے زیرِ اثر ہے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بالکل بے قیمت ہے۔ دراصل اخلاقی قدر و قیمت اور نیک و بد کے احکام جس چیز پر مترتب ہوتے ہیں۔ وہ صرف تیسری چیز ہے، یعنی انسان کا غیر مقدر اختیار۔

نظریہ کی حد تک یہ بات بہت معقول ہے لیکن اصلی مشکل یہ ہے کہ ہمارے
پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم انسان کے کردار میں فطرت اصلیہ، خارجی
ماحول اور غیر مقدر اختیار کے حصے الگ الگ متعین کر سکیں اور اپنے اخلاقی احکام
کو صرف تیسرے حصے کی حد تک محدود رکھیں۔ اگر اخلاقی قدر و قیمت کا انحصار صرف
اسی عنصر کی مقدار پر ہو تو ہمارے لئے کسی شخص کے متعلق نیک یا بد ہونے کا حکم
لگانا قطعاً ناممکن ہے۔ کسی آلہ سے ناپ کر، کسی ترازو سے تول کر، کسی طریق تحلیل
سے تجزیہ کر کے ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ ایک نیک آدمی کس حد تک اپنے غیر مقدر
اختیار کی بناء پر نیک ہے اور اسی طرح ہم یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ایک بُرا آدمی کہاں
تک مجبوراً بُرا ہے اور کہاں تک بالارادہ و بالاختیار بُرا۔ پس قدریت کے اس
نظریہ کو تسلیم کرنے سے ہمارے تمام اخلاقی احکام معطل ہو جاتے ہیں اور محض
معطل ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کے بعد تو ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے تمام
تعزیری قوانین منسوخ کر دیں، اپنی عدالتوں کو برخاست کر دیں اور جیلخانوں
کو توڑ ڈالیں کیونکہ جن مجرموں کو ہم پکڑتے ہیں اور جن پر ہمارے جج سزا کے فیصلے
صادر کرتے ہیں اور جن کو ہم جیلخانوں میں ٹھونس دیتے ہیں ان کے متعلق ہمارے
بڑے سے بڑے فاضل جج کو بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے جرم میں ان کے
اپنے غیر مقدر اختیار کا کس حد تک دخل ہوتا ہے اور جب یہ بنیادی چیز ہی غیر معلوم
ہے تو کسی طرح ممکن نہیں کہ سزا کی مقدار مجرم کے اختیار کی مقدار کے مطابق ہو۔
اس مرحلے پر قدریت ایک ایسی سرزمین میں پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اندھیرا

ہی اندھیرا ہے۔ وہ راستہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے کی خواہ کتنی ہی کوشش کرے مگر چند قدم بھی ٹھوکروں اور لغزشوں سے بچ کر نہیں چل سکتی۔ آخر وہ پلٹ کر جبریت سے کہتی ہے کہ اگر میرے نظریہ سے اخلاقی احکام معطل ہو جاتے ہیں اور عدالت کا نظام نہیں چل سکتا تو یہی بلکہ اس سے بھی زیادہ بُرا نتیجہ تیرے نظریہ سے بھی حاصل ہوتا ہے۔ تیرے نظریہ کی رُو سے تو انسان اپنے کسی فعل کا ذمہ دار ہی نہیں ہے پھر حسن و قبح کے احکام کس بنا پر؟ مدح یا ذم کس چیز کی؟ سزا و تعزیر کے فیصلے کس وجہ سے؟ ایک غیر ذمہ دار آدمی کا نیک و بد ہونا تو ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص کا مریض یا تندرست ہونا۔ پھر جب ایک شخص کو اس بنا پر سزا نہیں دی جاتی کہ اسے بخار کیوں ہے، تو ایک دوسرے شخص کو اس بنا پر کیوں سزا دی جائے کہ اس نے چوری کیوں کی؟

اس سوال کا جبریت کے پاس بھی کوئی معقول جواب نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وہ کہہ سکتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں ہر عمل اپنے کچھ قدرتی نتائج رکھتا ہے۔ جس طرح بیماری کا طبیعی نتیجہ تکلیف ہے اور تندرستی کا طبیعی نتیجہ لذت و راحت، جس طرح نیک چلنی کا طبیعی نتیجہ مدح اور انعام ہے اور بد چلنی کا طبیعی نتیجہ ذم اور سزا۔ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے جس طرح ہاتھ کا جل جانا ضروری ہے۔ اسی طرح جرم سے کسی نہ کسی قسم کی سزا پانا بھی ضروری ہے خواہ آدمی پر اس فعل کی کچھ ذمہ داری نہ ہو۔ لیکن یہ جواب صرف اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ ہم انسان کو ایک عقلی و نفسی وجود کے بجائے محض ایک مادّی وجود تسلیم کر لیں اور یہ مان لیں کہ انسان میں عقل، نفس، رُوح کوئی چیز نہیں ہے، صرف

طبیعت ہے جو ایک لگے بندھے قانون کے مطابق کام کئے جا رہی ہے اور انسان اسی طرح اس کے زیر اثر ہے جس طرح درخت، دریا، پہاڑ اور دوسری موجودات بیگرانسانی زندگی کے مظاہر کی یہ مشینی تعلیل کسی طرح قابل قبول نہیں ہے اس کے دلائل جن پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، نہایت کمزور ہیں اور اس کے تسلیم کر لینے کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ قانون، اخلاق، مذہب سب بے قدر و قیمت ہو جائیں اور خود انسان بحیثیت انسان ہونے کے دوسری موجودات کے مقابلہ میں کسی شرف عقلی و نفسی کا حامل نہ رہے۔

اخلاقیات کی ناکامی

اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ علم الاخلاق جبریت و قدریت کے درمیان فیصلہ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ خالص اخلاقی دلائل و شواہد سے ہم کو قطعی طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انسانی سیرت و کردار کے متعلق جبری نظریہ درست ہے یا قدری نظریہ۔ جتنے قوی دلائل انسان کو ذمہ دار فاعل مختار قرار دینے کے حق میں ہیں، قریب قریب اتنے ہی زبردست دلائل اس کو غیر ذمہ دار اور قطعاً بے اختیار قرار دینے کے حق میں بھی ہیں۔

دینیاتی نقطۂ نظر

اب اس مسئلہ کا آخری پہلو باقی رہ گیا ہے اور وہ دینیاتی پہلو ہے۔
دینیات میں یہ مسئلہ قریب قریب اسی حیثیت سے آتا ہے جس حیثیت سے
فلسفہ میں اس پر بحث کی گئی ہے مگر یہاں مشکلات اس سے بہت زیادہ ہیں۔
فلسفہ کی نظر تو صرف امور ماوراۓ طبیعت پر ہے اور انسان کی عملی زندگی سے اس
کو وہ تعلق نہیں ہے جو حکمتِ عملی یا اخلاقیات کو ہے، مگر دینیات نے کسی نہ
کسی طور سے حکمت عملی اور امور ماوراۓ طبیعت دونوں پر نظر کی ہے۔
اور اپنی تعلیمات میں دونوں کو جمع کیا ہے۔ دین ایک طرف تو انسان کو اوامر و
نواہی کا مخاطب ٹھہراتا ہے اور اطاعت پر جزا اور عصیان پر سزا کے مترتب
ہونے کا قانون پیش کرتا ہے جس کے لیے انسان کا اپنے اعمال میں ذمہ دار
اور کسی نہ کسی حد تک مختار ہونا ضروری ہے، اور دوسری طرف وہ ایک ایسی
بالاتر ہستی یا ایک ایسے بالاتر قانون کا تصور بھی پیش کرتا ہے جو انسان سمیت
تمام کائنات کو محیط ہے اور جس کی گرفت میں سارا عالم کون و فساد جکڑا ہوا

ؔ (Theological)

ہے۔ اس وجہ سے دینیات میں یہ مسئلہ فلسفے طبیعیات اور اخلاقیات تینوں سے زیادہ مشکل ہے۔ کیوں کہ یہ تینوں تو معاملہ کے محض کسی ایک پہلو کا اثبات کرنے اور دوسرے پہلو کو اس کے موافق کرنے کی خاطر توڑنے مروڑنے کے لیے آزاد ہیں لیکن دین بیک وقت دونوں کا اثبات کرتا ہے اور وہ اپنے اس طریقہ کو عقل کے مطابق ثابت کرنے کے لیے مجبور ہے کہ ان دونوں متعارض باتوں میں موافقت کی کوئی متوسط صورت نکالے۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے کہ دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس مشکل کو حل کرنے کی کیا صورت اختیار کی ہے، کیونکہ مجھ سے سوال صرف اسلام کے متعلق کیا گیا ہے اور اختصار کی خاطر بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی بحث کو صرف اسی حد تک محدود رکھوں۔

صحیح اسلامی مسلک

جن مسائل کا تعلق امور ماورائے طبیعت سے ہے ان کے بارے میں اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے کہ جس چیز کا جاننا اور جس حد تک جاننا ضروری تھا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول نے بتادی ہے، اس سے زیادہ کا کھوج لگانا اور ایسی باتوں میں خوض کرنا جن کے متعلق یقینی معلومات حاصل کرنے یا جن کی کنہ کو پہنچنے کے ذرائع ہمارے پاس نہیں ہیں اور جن کے نہ جاننے سے ہم کو کسی قسم کا نقصان بھی نہیں ہے، لاحاصل بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (المائدہ : ۱۰۱)

"ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو جن کو اگر تم پر ظاہر کیا جائے تو تم کو بُرا معلوم ہو"

اور اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ :

مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (الحشر)

"جو کچھ رسول نے تم کو دے دیا ہے وہ لے لو اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز آؤ"

اور اسی لئے حدیثِ نبوی میں کثرتِ سوال اور فضول باتوں میں تکلف کرنے کو ناپسند قرار دیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِنَّ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَا لَا یَعْنِیْہِ[1] (آدمی کے اسلام کی بہتری اس میں ہے کہ وہ بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے)

یہ تقدیر کا مسئلہ بھی منجملہ انہی مسائل کے ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار تاکید فرمائی ہے کہ اس مسئلہ میں بحث کرنے سے پرہیز کیا جائے۔ ایک مرتبہ صحابہؓ آپس میں اس مسئلہ میں بحث کر رہے تھے، اتنے میں آنحضرتؐ تشریف لے آئے اور یہ باتیں سنکر آپؐ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ آپؐ نے فرمایا "کیا انہی باتوں کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ کیا اسی لیے میں تم میں بھیجا گیا ہوں؟ ایسی ہی باتوں سے پچھلی قومیں ہلاک ہوئی ہیں۔ میرا فیصلہ

---

[1] یہ حدیث امام زہری نے امام زین العابدین رضؓ کے واسطہ سے روایت کی ہے (ترمذی)

یہ ہے کہ تم اس معاملہ میں جھگڑا نہ کرو۔[1] ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا۔
جو شخص تقدیر کے بارے میں گفتگو کریگا۔ اس سے تو قیامت کے دن سوال کیا
جائیگا۔ مگر جو خاموش رہے گا اس سے کچھ سوال نہ ہوگا۔[2] مطلب یہ کہ یہ مسئلہ ان
ان معاملات میں سے نہیں ہے جن کے بارے میں کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنا شرعاً
تمہارے لیے ضروری ہو لہذا اگر تم اس معاملہ پر کوئی گفتگو نہ کرو تو قیامت میں تم سے
کوئی سوال نہ ہوگا لیکن اگر تم نے کلام کیا تو لامحالہ یا وہ غلط ہوگا یا صحیح اور غلط ہونے
کی صورت میں تم ایک ایسی بات میں پکڑے جاؤ گے جس سے بحث کرنے کی تم کو
کوئی ضرورت نہ تھی۔ پس بولنے میں نقصان کا احتمال ہے اور نہ بولنے میں کوئی نقصان
نہیں۔ ایک اور موقع پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم رات کے وقت حضرت علی اور حضرت
فاطمہ علیہا السلام کے مکان پر تشریف لے گئے اور پوچھا تم لوگ نماز تہجد کیوں
نہیں پڑھتے؟ حضرت علی نے جواب دیا۔ "یارسول اللہ! ہمارے نفس اللہ کے
ہاتھ میں ہیں، وہ چاہے گا کہ ہم اٹھیں تو اٹھ جائیں گے۔" یہ سن کر حضور فوراً واپس
ہو گئے اور اپنی ران پر ہاتھ مار کر فرمایا۔

"وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا"[3]

"انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے۔"

---

[1] یہ حدیث مختلف طریقوں سے حضرت عمر، حضرت عائشہ، حضرت انس، حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عمر بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے (دیکھو ترمذی، ابن ماجہ)

[2] یہ حدیث حضرت عائشہ سے مروی ہے۔

[3] اس حدیث کو زہری نے امام زین العابدین سے اور انہوں نے حسین ابن علی رضی اللہ عنہما
(آگے صفحہ ۴۸ پر)

یہی وجہ ہے کہ محدثین اور فقہا کے گروہ نے صرف وَالْقَدَرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ ط (تقدیر اچھی اور بری اللہ کی طرف سے ہے) کے مجمل اعتقاد پر اکتفا کیا ہے اور اس باب میں زیادہ کھوج لگانے اور جبر یا قدر کا قطعی حکم لگانے والوں کی سخت مذمت کرتے رہے ہیں لیکن رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ سلف کی ممانعت کے باوجود دوسری قوموں کے مسائلِ فلسفہ وطبیعیات کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی پیدا ہوا اور اس کثرت سے اس پر بحث کی گئی کہ آخر کار یہ اسلامی علم کلام کے مہمات مسائل میں داخل ہو گیا۔

متکلمینِ اسلام کے مذاہب

متکلمینِ اسلام کے اس بارے میں دو مشہور مذہب ہیں جو قدریہ اور جبریہ کہلاتے ہیں۔ یہاں اُن کی تمام بحثوں کو نقل کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے ایک مستقل کتاب کی وسعت درکار ہے تاہم میں ان کے مقالات کا ایک واضح خلاصہ یہاں پیش کروں گا۔

مذہب قدر

معتزلہ اور بعض دوسرے فرقوں کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا، اس کو افعال پر قدرت بخشی اور نیکی وبدی کا اختیار اسی کو تفویض کر دیا۔ اب وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ) سے روایت کیا ہے (بخاری ونسائی) محدثین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس پلٹ جانے اور آیت پڑھنے کی مختلف توجیہیں کی ہیں مگر میں اس کے صاف معنی یہ سمجھتا ہوں کہ عملی زندگی کے مسائل میں تقدیر کے مسئلہ سے استدلال کرنے کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔

خود اپنی قدرت کے مطابق اور اپنی مشیئت کے موافق استقلال کے ساتھ اچھے اور برے افعال کرتا ہے اور اپنے اسی اختیار کی بنا پر دنیا میں مدح وذم اور آخرت میں ثواب وعذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے نہ اس کو کفر ومعصیت پر مجبور کیا گیا ہے اور نہ ایمان واطاعت پر، بلکہ وہ اپنے رسولوں کو بھیجتا ہے، کتابیں نازل کرتا ہے، نیکی کا حکم دیتا اور بدی سے منع کرتا ہے، صحیح اور غلط، حق اور باطل کو واضح طور پر ممیز کرتا ہے اور ان کو خبردار کر دیتا ہے کہ اگر سیدھا راستہ اختیار کرو گے تو نجات پاؤ گے اور غلط راستہ پر چلو گے تو اس کا برا نتیجہ دیکھو گے۔

اس مذہب کے قواعد سب سے پہلے واصل بن عطا الغزال نے مقرر کیے تھے جس کا قول تھا کہ باری تعالیٰ حکیم عادل ہے۔ اس کی طرف شر اور ظلم کی اضافت جائز نہیں ہے۔ نہ یہ جائز ہے کہ اللہ نے خود ہی اپنے بندوں کو جن اوامر ونواہی سے مکلف کیا ہے۔ ان کے خلاف اعمال کے صدور کا وہ خود ارادہ کرے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ بندوں کو کسی ایسے فعل پر سزا دے جس کا ارتکاب انہوں نے اس کے حکم ہی سے کیا ہو۔ لہٰذا بندہ ہی فاعل خیر وشر ہے۔ وہی ایمان وکفر اور اطاعت معصیت اختیار کرتا ہے اور اللہ نے ان سب کاموں کی قدرت اس کو عطا کر دی ہے۔ ابراہیم بن سیار النظّام نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ خدا صرف خیر پر قدرت رکھتا ہے۔ شر، درد، معاصی اس کی قدرت سے خارج ہیں۔ معمر بن عباد السلمی اور ہشام بن عمرو الفوطی نے اس میں اور زیادہ شدت اختیار کی اور وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ کا اعتقاد رکھنے والے کو کافر اور گمراہ ٹھہرایا، کیونکہ یہ اعتقاد ان کے نزدیک باری تعالیٰ کی تنزیہ کے خلاف ہے اور اس کی رو سے حق تعالیٰ ظالم ٹھہرتا ہے

ان کے بعد جاحظ، خیاط، کعبی، جبائی، قاضی عبدالجبار وغیرہ جتنے بڑے بڑے معتزلہ گزرے ہیں سب نے پورے زور کے ساتھ یہ حکم لگایا ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق خدا نہیں ہے بلکہ بندے خود ان کے خالق ہیں اور یہ کہ خدا کے لیے تکلیف ما لا یطاق جائز نہیں ہے

قرآن مجید سے قدریہ کا استدلال۔

اس مذہب کی تائید میں معتزلہ نے قرآن مجید کی بہت سی آیات سے استدلال کیا ہے مثلاً:۔

(۱) وہ آیات جن میں بندوں کے افعال خود بندوں ہی کی طرف منسوب کیے گئے ہیں جیسے:۔

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ (بقرہ ۲۸)

"تم کیسے خدا کے ساتھ کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے خدا نے تم کو زندہ کیا"

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ (بقرہ ۔ ۷۹)

"پس تباہی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے"

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (الانفال ۵۳)

"یہ اسی وجہ سے ہے کہ خدا کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو دی ہو بدلتا نہیں ہے جب تک کہ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتی۔"

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ (النساء: ۱۲۳)

"جو برا عمل کرے گا اسی کے مطابق بدلہ پائے گا۔"

كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (الطور - ۲۱)

"ہر شخص اپنی کمائی کے بدلے رہن ہے"

(۲) وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ انسان کے اپنے اعمال پر جزا و سزا مترتب ہوگی جیسے :-

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ (المومن: ۱۷)

"آج ہر متنفس کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔"

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ: ۲۸)

"آج تم کو ان اعمال کا بدلہ دیا جائیگا جو تم کرتے تھے۔"

هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (النمل - ۹۰)

"کیا تمہیں اس کے سوا کوئی اور بدلہ دیا جائیگا جو تم عمل کرتے رہے ہو؟"

(۳) وہ آیات جن میں شر اور ظلم اور مذمومات سے باری تعالیٰ کے فعل کو منزہ قرار دیا گیا ہے جیسے :

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (السجدہ - ۷)

"جس نے ہر چیز جو پیدا کی خوب ہی پیدا کی۔"

اور ظاہر ہے کہ کفر اچھی چیز نہیں ہے :-

"وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ (الحجر - ۸۵)

"اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے اس کو پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ۔"

(۳) اور مسلّم ہے کہ کفر حق نہیں ہے!

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (حم السجدہ - ۴۶)

"اور تیرا رب بندوں کے لیے ہرگز ظالم نہیں ہے۔"

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ (آل عمران - ۱۰۸)

"اور اللہ جہان والوں کے لئے ہرگز ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا۔"

(۴) وہ آیات جن میں کافروں اور گنہ گاروں کو ان کے برے افعال پر ملامت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ ان کو ایمان وطاعت سے روکنے والی کوئی خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - ۹۴)

"لوگوں کے پاس جب ہدایت آئی تو انہیں ایمان لانے سے روکنے والی کوئی چیز اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے کہا کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟"

مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ (ص - ۷۵)

"تجھے کس چیز نے اس سے روکا کہ تو سجدہ کرے؟"

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (الانشقاق - ۲۰)

"انہیں کیا ہوگیا ہے کہ ایمان نہیں لاتے"

لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (آل عمران - ۱۰۰)

"تم کیوں خدا کی راہ سے روکتے ہو"

اگر فی الواقع خدا نے ہی لوگوں کو ایمان لانے سے روکا ہوتا اور انہیں کفر و معصیت پر مجبور کیا ہوتا تو ان سے اس قسم کے سوالات کرنے جائز نہ ہوتے اگر کوئی شخص کسی کو حجرے میں بند کر دے اور کہے کہ تو کیوں نہیں نکلتا تو یہ ایک غیر معقول سوال ہوگا۔ پھر خدا کی طرف یہ بات کیسے منسوب کی جا سکتی ہے کہ ایک طرف تو ان کو حق سے پھیر دے اور پھر کہے کہ تم کہاں پھیرے چلے جا رہے ہو (اَنّٰى تُصْرَفُوْنَ) خود ان کو بھٹکائے اور پوچھے کہ تم کدھر بھٹکے جا رہے ہو؟ (اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ) ان میں کفر خلق کرے اور پھر پوچھے کہ تم کیوں کفر کرتے ہو؟ (لِمَ تَكْفُرُوْنَ) انہیں حق پر باطل کے پردے ڈالنے پر مجبور کرے اور پھر کہے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ (لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ)

(۵) وہ آیات جن میں ایمان اور کفر کو بندوں کی مشیّت سے متعلق کہا گیا ہے۔ جیسے:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف - ۲۹)

"پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کرے"

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (المزمل - ۱۹)

"پس جس کا جی چاہے اپنے رب کا رستہ اختیار کرے"

یہی نہیں بلکہ ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے کفر و معصیت کو مشیّت

الٰہی کی طرف منسوب کرتے ہیں، جیسے:۔

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَآ اَشْرَکْنَا

"مشرکین ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم ہرگز شرک نہ کرتے"۔ (الانعام۔ ۱۴۸)

وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰہُ مَا عَبَدْنَا

مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ (النحل۔ ۳۵)

"اور مشرکین نے کہا کہ اگر اللہ چاہتا تو اس کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کرتے"

(۶) وہ آیات جن میں بندوں کو حسن عمل کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ مثلاً:۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ (آل عمران۔ ۱۳۴)

"اور دوڑو اپنے رب کی مغفرت کی طرف"

اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ (الاحقاف۔ ۳۱)

"اللہ کے منادی کی پکار پر لبیک کہو"

وَاَنِیْبُوْٓا اِلٰی رَبِّکُمْ (الزمر۔ ۵۴)

"اپنے رب کی طرف رجوع کرو"

ظاہر ہے کہ طاعت کا حکم دینا اور اس طرف دوڑنے اور لپکنے کی تاکید کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے، جب تک کہ مامور میں اس کی قدرت نہ ہو۔ یہ تو ایسا ہی ہے، جیسے کسی اپاہج سے کہا جائے کہ اٹھ اور دوڑ۔

(۷) وہ آیات جن میں بیان کیا گیا ہے کہ بندے ایسے افعال کرتے ہیں کہ جن کا خدا نے ان کو حکم نہیں دیا ہے۔ جیسے۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ

اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (النساء - ۶۹)

" وہ ارادہ رکھتے ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اس کا انکار کریں "

" اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ (الاعراف : ۲۸)

" اور اللہ بے شرمی کے کاموں کا ہرگز حکم نہیں دیتا "

" وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ (الزمر - ۷)

" اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا "

" وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ (البینۃ : ۵)

" اور انہیں حکم نہیں دیا گیا تھا مگر یہ کہ اللہ کی عبادت کریں "

(۸) وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ لوگ اپنے کیے کی سزا بھگتتے ہیں، جیسے:

ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا کَسَبَتْ اَیْدِی النَّاسِ ط (الروم : ۴۱)

" خشکی اور تری میں فساد پھوٹ پڑا لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے سبب سے

وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ (الشوریٰ : ۳۰)

" تم پر جو مصیبت بھی آئی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے "

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّلٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ (یونس ۴۴)

" یقیناً اللہ لوگوں پر کوئی ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں "

وَمَا کُنَّا مُھْلِکِی الْقُرٰٓی اِلَّا وَاَھْلُھَا ظٰلِمُوْنَ (القصص - ۵۹)

"اور ہم ہرگز بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہیں ہیں الاّ یہ کہ ان کے باشندے ظالم ہوں۔"

(۹) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہدایت اور گمراہی پر مجبور نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے اختیار سے کوئی ایک راستہ منتخب کرتا ہے مثلاً:۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حٰم السجدہ: ۱۷)

"رہے ثمود تو ان کو ہم نے راستہ دکھایا، مگر انہوں نے اندھے بن کر چلنے کو راستہ دیکھ کر چلنے پر ترجیح دی۔"

فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ (یونس - ۱۰۸)

"جو ہدایت قبول کرتا ہے اس کا ہدایت قبول کرنا اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے۔"

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (بقرہ ۲۵۶)

"دین میں کوئی زبردستی نہیں، راست روی، کج روی سے میز کر کے پیش کر دی گئی ہے اب جو طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے ایک مضبوط سہارا تھام لیا۔"

(۱۰) وہ آیات جن میں انبیاءؑ نے اپنے قصوروں کا اعتراف کیا ہے اور ان کو خود اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ مثلاً:۔

حضرت آدمؑ کہتے ہیں۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (اعراف: ۲۳)

"اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا"

حضرت یونسؑ کہتے ہیں۔

سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (انبیاء - ۸۷)

"پاک ہے تیری ذات، قصور وار تو میں خود ہی تھا"

حضرت موسیٰؑ کہتے ہیں۔

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ (قصص - ۱۶)

"پروردگار! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا"

حضرت نوحؑ کہتے ہیں۔

رَبِّ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْـَٔلَكَ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ (ہود - ۴۷)

"پروردگار! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میں تجھ سے ایسی درخواست کروں جس کے نامناسب ہونے کا مجھے علم نہ ہو"

مذہب جبر

دوسری طرف جبریہ ہیں جو کہتے ہیں کہ کوئی چیز اللہ کے ارادے کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ عام اس سے کہ وہ اشیاء کی ذوات ہوں یا ان کی صفات۔ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ کائنات میں ہر ہر ذرّے کی حرکت قضا و قدر کے تحت واقع ہوتی ہے، وجود اور ایجاد میں اللہ کے سوا کوئی چیز تاثیر نہیں رکھتی۔ خلق اور ابداع میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے جو کچھ اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو اللہ نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔ کوئی شے اس کے حکم اور اس کی قضا کے خلاف بال برابر حرکت نہیں کر سکتی۔ اس کے افعال پر حسن یا قبح کا حکم لگانا عقل کے امکان میں نہیں ہے۔

اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے، دنیا میں ہم جن حوادث کو اسباب کے تحت صادر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، وہ محض ظاہر کے لحاظ سے تحت اسباب ہیں ورنہ حقیقتاً سب کا صدور اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے اور تمام ارضی و سماوی حوادث کا فاعل حقیقی وہی ہے۔

اس بنیادی عقیدے سے متعدد فرعی اعتقادات نکلے ہیں جہم بن صفوان اور شیبان بن مسلم خارجی کا مذہب ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے، نہ وہ ارادہ رکھتا ہے اور نہ اختیار، اللہ تعالیٰ جس طرح جمادات، نباتات اور دوسری چیزوں میں افعال پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح انسان میں بھی پیدا کرتا ہے۔ انسان کی طرف افعال کی نسبت محض مجازی ہے، رہا ثواب و عذاب تو جس طرح افعال جبری ہیں اسی طرح جزاء و سزا بھی جبری ہے۔ یعنی جس طرح جبر کی بنا پر انسان اچھے اور برے افعال کرتا ہے اسی طرح جبر ہی کی بنا پر اسے جزا اور سزا بھی دے دی جاتی ہے۔ یہ خالص جبریت ہے جو معتزلہ کی خالص قدریت کے مقابلہ میں ہے۔

ایک دوسری جماعت جس میں حسین النجار، بشر بن غیاث المریسی، ضرار بن عمرو، حفص الفرد، اور ابو عبداللہ محمد بن کرام، شعیب بن محمد الخارجی اور عبداللہ بن اباض بانی فرقہ اباضیہ وغیرہ شامل ہیں، خدا کو انسان کے اچھے اور برے اعمال کا خالق تو قرار دیتی ہے، مگر اس کی رائے میں بندوں کو ایک طرح کی قدرت و ارادۂ حادثہ بھی حاصل ہے جس کا کچھ نہ کچھ حصہ ان افعال کے صدور میں ضرور ہے۔ اس کا نام انہوں نے "کسب" رکھا ہے۔ اسی کسب کی وجہ سے انسان کو امر و نہی کے احکام دیئے گئے ہیں اور اسی کے لحاظ سے آدمی عذاب و ثواب کا مستحق ہوگا۔

امام ابوالحسن اشعری نے "کسب" کو تو تسلیم کیا اور انسان کے لیے قدرت حادثہ بھی ثابت کی مگر اس قدرت کی تاثیر سے انکار کر دیا۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ اپنے بندے سے جس فعل کے صدور کا ارادہ کرتا ہے وہ بندہ کی قدرت حادثہ کے تحت صادر ہو جاتا ہے، لیکن یہ قدرت محض ایک آلہ ہے ارادۂ الٰہی کے فعل میں آنے کا، ورنہ حقیقتاً خود اس قدرت میں کوئی تاثیر نہیں جو فعل کے وجود میں آنے کی علت ہو۔

قاضی ابوبکر باقلانی نے اس سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ ان کی رائے میں انسان کے ہر فعل کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اس کے نفس فعل ہونے کا ہے بلا اعتبار حسن و قبیح و خیر و شر، اور دوسرا پہلو اس کے طاعت اور معصیت ہونے کا ہے۔ مثلاً نماز اور روزہ کہ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ وہ عبادت اور طاعت ہے۔ ان میں سے پہلا رُخ باری تعالےٰ کی طرف منسوب ہوگا کیونکہ وہ اسی کی قدرت سے ظہور میں آتا ہے اور دوسرا رُخ بندہ کی طرف کیونکہ اسی پہلو سے ایک فعل بندے کی قدرت حادثہ کے تحت رونما ہوتا ہے لٰہذا اسی پر جزا و سزا مترتب ہوتی ہے۔

استاذ ابو اسحٰق اسفرائینی نے اس مسلک سے بھی اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک فعل بجائے خود اور فعل کی صفات (یعنی اس کا حسن و قبیح) دونوں معاً بندے اور خدا دونوں کی قدرت کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔

امام الحرمین نے ان دونوں کے مذہب کو رد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بندے میں قدرت اور ارادہ پیدا کیا ہے۔ پھر اسی قدرت اور ارادہ سے بندے کے مقدورات اور مرادات حاصل ہوتے ہیں۔

آخر میں امام رازی آتے ہیں جو مذہب جبر کے پر زور وکیل ہیں۔ وہ بندہ

کی قدرت کے لیے کسی قسم کی تاثیر تسلیم نہیں کرتے۔ "کسب" کو ایک اسم با مسمٰی سمجھتے ہیں، خدا کو بندوں کے تمام اعمال کا خالق قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ کفر اور ایمان، طاعت اور معصیت، ہدایت اور ضلالت، سب کچھ خدا ہی اپنے بندوں میں پیدا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کسی سے کفر کے صدور کا ارادہ کرے اور وہ مومن ہو جائے، خدا کے علم میں کوئی شخص مومن ہو اور وہ کافر ہو جائے، خدا نے کسی میں طاعت پیدا کی ہو اور وہ اس کے خلاف عاصی ہو جائے۔ رہا یہ سوال کہ جب ان سب چیزوں کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے، اور بندوں میں اسکے خلاف چلنے کی طاقت نہیں ہے، تو پھر اوامر و نواہی کی تکلیف کیونکر جائز اور معقول ہو سکتی ہے؟ تو اس کا جواب امام صاحب یہ دیتے ہیں کہ خدا کے لیے تکلیف مالا یطاق جائز ہے اور اس کے کاموں میں کیوں اور کس لیے کا سوال نہیں ہو سکتا۔

بہرحال اشاعرہ اور ان کے ہمخیال حضرات خواہ کسب کے قائل ہوں یا نہ ہوں اور قدرت حادثہ کے لیے کسی قسم کی تاثیر مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔ ان کے استدلال کا منطقی نتیجہ خالص جبر ہی ہے، کیونکہ جب خدا اپنے بندوں کا خالق ہے اور اسی نے ان سے اچھے اور برے اعمال کے صدور کا ارادہ کیا ہے تو دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور ہو گی یا تو بندے میں قضائے الٰہی کے خلاف عمل کرنے کی قدرت ہو گی یا نہ ہو گی؟ بصورت اوّل میں بندے کی قدرت اور اس کے ارادہ کا خدا کی قدرت اور اس کے ارادہ پر غالب آجانا لازم آتا ہے جو بالاتفاق باطل ہے۔ بصورتِ دوم خدا کی قدرت کے آگے بندے کی قدرت کا بے اثر اور خدا کے ارادہ کے سامنے بندے کے ارادہ کا بے چارہ ہونا لازم آتا ہے جس کے

بعد کسب اور قدرت حادثہ کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یہی خالص جبریت ہے اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جبریت کے مقدمات کو تسلیم کر لینے کے بعد کوئی شخص عقیدۂ جبر کی انتہا کو پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بیچ میں کسی مقام پر ٹھیر جانا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔[1]

---

[1] بالکل یہی حال مسیحی متکلمین کا بھی ہے۔ ان کے ایک بڑے گروہ کے عقائد اس باب میں وہی ہیں جو اشاعرہ کے ہیں۔ سینٹ اگسٹائن (St. Augustine) نے جبریت خالصہ سے بچنے کی بہت کوشش کی ہے مگر خدا کو فاعلِ حقیقی اور انسان کو محض ایک منفعل ہستی مان لینے کے بعد وہ اپنے مذہب کو خالص جبریت سے نہیں بچا سکا۔ اسکوٹس اریجینا (SCOTUS ERIGENA) مدرسیت مسیحی علم کلام (SCHOLASTICISM) کا بانی اول ہے۔ خدا کے فاعلِ افعال عباد ہونے میں انتہا درجہ کا غلو کرتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا تمام کائنات کی روح ہے اور وہ خدا ہی ہے جو زندگی، قوت، نور، عقل بن کر موجودات عالم میں اپنے کرشمے دکھا رہا ہے۔ سینیٹ آنسلم (St. Anselm) عام مسیحی اعتقاد کے مطابق انسان کے پیدائشی گناہ اور پھر خدا کے مسیح کی شکل میں نزول کرنے، اور انسان کے گناہ کا کفارہ بننے کا قائل ہے، اور ظاہر ہے کہ اس اعتقاد میں جبریت کے سوا کسی اور چیز کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ایبلارڈ (Abelard) اور سینٹ ٹامس اکوم (St. Thomas of Aquin) دونوں ارادۂ الٰہی کو وجوبی و جبری قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک خدا ہی بندوں کے تمام اعمال کا خالق ہے بلکہ موخر الذکر نے تو اشاعرہ سے تکلیف مالا یطاق کے جواز کا عقیدہ بھی اخذ کر لیا ہے۔ ممتاز مدرسین میں صرف ایک ڈنس اسکوٹس (Duns Scotus) ایسا شخص ہے جس نے معتزلہ کی طرح قدریت کا مذہب اختیار کیا ہے۔

قرآن مجید سے جبریہ کا استدلال

لطف یہ ہے کہ جبریہ بھی اپنے مذہب کے حق میں قرآن مجید ہی سے ثبوت پیش کرتے ہیں اور ایک دو نہیں سینکڑوں آیتیں ایسی پیش کر دیتے ہیں جو قدریت کی مخالف اور جبریت کی زبردست مؤید ہیں مثلاً :

(۱) وہ آیات جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام قوت کا مالک خدا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کا خالق ہے۔ دنیا میں اس کے اذن کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا :

اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا (بقرہ - ۱۶۵)

" یہ کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کی ہے "

وَمَا هُمْ بِضَآرِّیْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (بقرہ - ۱۰۲)

" اور وہ اپنے اس جادو کے ذریعے سے کسی کو ضرر نہیں پہنچا سکتے تھے مگر اللہ کے اذن سے "

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف : ۵۴)

خبردار خلق بھی اسی کا ہے اور امر بھی اسی کا

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (الرعد - ۱۶)

" کہو، اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور وہ ایک ہے اور سب پر غالب ہے "

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (الصّٰفّٰت - ۹۶)

حالانکہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور ان چیزوں کو بھی جنہیں تم بناتے ہو"

(۲) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر واقعہ کے متعلق خدا کا فیصلہ پہلے ہی سے لکھا جا چکا ہے اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی فیصلہ کے مطابق ہوتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱) ایکے نزدیک انسان کو ارادہ کرنے یا نہ کرنے اور اپنے ارادہ کو فعل میں لانے یا نہ لانے کا پورا اختیار حاصل ہے اور خدا کی قدرت انسان کی آزادی اختیار میں مانع نہیں ہے۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُعَمَّرٍ وَلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ (فاطر۔ ۲)

"نہیں حاملہ ہوتی کوئی مادہ اور نہیں وضع حمل کرتی مگر وہ اس کے علم میں ہوتی ہے اور نہیں دراز ہوتی کسی دراز عمر والے کی عمر نہ کسی کی عمر میں کوئی کمی ہوتی ہے مگر یہ سب کچھ ایک نوشتہ میں لکھا ہے۔"

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ (بنی اسرائیل۔ ۴)

"اور ہم نے بنی اسرائیل کو بتا دیا تھا کتاب میں کہ تم ضرور دو مرتبہ زمین میں فساد کرو گے۔"

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ (آل عمران۔ ۱۶۶)

"اور جو مصیبت تم پر دونوں گروہوں کی مڈبھیڑ کے روز آئی وہ اللہ کے اذن سے تھی۔"

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا۔ (الحدید۔ ۲۳)

"کوئی مصیبت زمین میں یا تمہارے اپنے نفوس میں نہیں پہنچتی مگر یہ کہ وہ ایک نوشتہ میں لکھی ہوئی ہوتی ہے قبل اس کے کہ ہم اسے ظہور میں لائیں۔"

(۳) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر دی ہے۔ رزق، عزت و دولت، راحت و مصیبت، موت و حیات سب اسی تقدیر کے مطابق ہیں۔ اس میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر۔ ۴۹)

"ہم نے ہر چیز جو پیدا کی ہے اسے ایک اندازے پر رکھا ہے۔"

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (الشوریٰ ۱۲)

"آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے نپا تلا کر دیتا ہے"

وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ (الشوریٰ ۲۷)

"مگر وہ نازل کرتا ہے ایک اندازے پر جو وہ چاہتا ہے۔"

وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (النساء: ۷۸)

"اگر انہیں کوئی بھلائی نصیب ہوتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری بدولت ہے۔ کہو، سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔"

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (اعراف ۳۴)

"ہر قوم کے لیے ایک مدت ہے پھر جب ان کی مدت آن پوری ہوتی ہے تو ایک گھڑی بھر کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔"

(۴) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کی مشیت خدا کی مشیت کے تابع ہے، بندے کو کچھ اختیار نہیں، سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ انسان

اپنی تدبیر سے خدا کے فیصلوں کو بدلنے کی قوت نہیں رکھتا۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (الدہر۔ ۳۰)

"اور تم کیا چاہتے ہو الا یہ کہ اللہ چاہے"

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (آل عمران۔ ۱۲۸)

"تیرے ہاتھ میں کچھ اختیار نہیں ہے"

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (کہف۔ ۲۳)

"اور کبھی کسی چیز کے متعلق یوں نہ کہو کہ میں کل ایسا کر کے رہوں گا (تمہاری یہ بات پوری نہیں ہو سکتی) الا یہ کہ اللہ چاہے"

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ (آل عمران۔ ۱۵۴)

"کہو اختیار بالکل اللہ کا ہے"۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران)

"کہو، اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے نصیب میں قتل لکھ دیا گیا تھا وہ اپنے مقتل کی طرف خود نکل آتے"۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ (الانعام۔ ۱۷، ۱۸)

"اور اگر اللہ تجھے کسی تکلیف میں مبتلا کرے تو اُسے ہٹانے والا کوئی نہیں اس کے

سوا، اور اگر وہ تیرے لیے کچھ بہتری کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ اپنے بندوں پر پورا غلبہ رکھتا ہے۔

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ۝ (فاطر - ۴۳)

"پس تم خدا کے ضابطہ میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور نہ کوئی ایسی طاقت پاؤ گے جو اللہ کے ضابطہ کو پھیر دے۔

(۵) وہ آیات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت اور ضلالت کا رشتہ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا (بقرہ -)

اللہ اس کے ذریعہ سے گمراہ کر دیتا ہے بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے بہتوں کو"

مَنْ يَشَإِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَشَأْ يَجْعَلْهُ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ (الانعام - ۳۹)

"اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے"

فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ (انعام - ۱۲۵)

"پس اللہ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے"

أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ ۖ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ

فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا (نساء - ۸۸)

"کیا تم چاہتے ہو کہ ہدایت بخشو اس شخص کو جسے اللہ نے گمراہ کیا ہو حالانکہ جسے اللہ نے گمراہ کیا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے"

وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ (مائدہ - ۴۱)

"جسے اللہ فتنہ میں ڈالنا چاہے اسے تم اللہ سے نہیں بچا سکتے۔ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ ہی نے پاک کرنا نہ چاہا"

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا

عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا إِلَّا أَنْ يَشَاءَ

اللَّهُ (انعام - ۱۱۲)

"اگر ہم ان کی طرف ملائکہ کو بھی نازل کر دیتے اور مُردے ان سے باتیں کرتے اور ہر چیز کو ہم اُن کے آگے رُو در رُو جمع کر دیتے تب بھی وہ ایمان لانے والے نہ تھے الا یہ کہ اللہ ہی چاہے"

(۶) وہ آیات جن میں کہا گیا ہے کہ خدا کی مشیت ہی یہ نہ تھی کہ سب لوگ ایمان لے آئیں اور اختلاف نہ کریں ورنہ خدا چاہتا تو سب ایمان لے آتے اور دین کے معاملہ میں کوئی جھگڑا باقی نہ رہتا۔

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (بقرہ - ۲۵۳)

"اگر اللہ چاہتا تو وہ نہ لڑتے مگر اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے"

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (یونس-۹۹)

"اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگ ایمان لے آتے جو زمین میں ہیں پھر کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ ایمان لے آئیں؟ حالاں کہ کوئی متنفس مومن نہیں ہو سکتا اللہ کے اذن کے بغیر"

اس ضمن میں وہ آیات بھی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ بہت سے لوگ دوزخ ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں مثلاً:۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ (اعراف ۱۷۹)

"ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو جہنم ہی کے لیے پیدا کیا ہے"

(۷) وہ آیات جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا نے کافروں اور منافقوں کو ایمان اور حسنِ عمل سے روک دیا ہے اور ایسے لوگ راہِ راست پر آہی نہیں سکتے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ اوامر و نواہی کے لیے مکلف قرار دیئے گئے ہیں اور سرتابی و سرکشی کے عوض ان کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (بقرہ ۶-۷)

"حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے لیے یکساں ہے خواہ

تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ بہرحال ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور ان کے لیے بڑی سزا ہے۔"

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا ۔ (بقرہ - ۱۰)

ان کے دلوں میں بیماری ہے پس اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا۔"

وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۔ (انعام ۲۵)

اور ہم نے ان کے دلوں پر غلاف چڑھا دیئے ہیں (جو انہیں روکتے ہیں اس سے کہ) وہ اسے سمجھیں اور ان کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے۔"

وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ (التوبہ - ۴۶)

مگر اللہ نے ان کے اٹھنے کو پسند نہ کیا اس لیے اس نے انہیں سست کر دیا۔"

وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ (اعراف - ۱۰۰)

" اور ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پھر وہ نہیں سنتے"

(۸) وہ آیات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں کو جن برے اعمال کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں مبتلا تے عذاب کیا جاتا ہے وہ خدا ہی کے حکم و ارادے کے تحت ان سے سرزد ہوتے ہیں۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا ۔ (بنی اسرائیل - ۱۶)

" اور جب ہم ارادہ کرتے ہیں کہ بستی کو ہلاک کریں تو بستی کے خوشحال لوگوں کو حکم

دیتے ہیں پھر وہ اس بستی میں فسق کرنے لگتے ہیں"

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا (انعام ۔ ۱۲۳)

"اور ہم نے اسی طرح ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرموں کو لگا رکھا ہے کہ وہ اس میں چالبازیاں کریں"

زَيَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ يَعْمَهُوْنَ ؕ (النمل ۔ ۴)

"ہم نے ان کے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا ہے پس وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں"

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (کہف ۔ ۲۸)

"اور ایسے شخص کی بات نہ مان جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کی"

(۹) وہ آیات جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا ہی نے ان شیاطین اور ائمہ شر کو انسان پر مسلط کیا ہے جو اس کو بہکاتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا (مریم ۔ ۸۳)

"دیکھتے نہیں ہو کہ ہم نے شیاطین کو ان کافروں کی طرف چھوڑ دیا ہے اور وہ انہیں خوب بھڑکا رہے ہیں"

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (قصص ۔ ۴۱)

"اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا ہے جو آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔"

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (حٰمٓ السجدہ۔ ۲۵)

"اور ہم نے ان کے لیے مقرر کر دیے ہیں ایسے ساتھی جو ان کے سامنے اور ان کے پیچھے کی چیزوں کو ان کے لیے خوشنما بناتے ہیں۔"

متکلمین کی ناکامی

متکلمین اسلام کے ان دونوں گروہوں کی تقریریں دیکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلہ جبر و قدر کو حل کرنے میں دونوں کو ناکامی ہوئی ہے مگر اس ناکامی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے قرآن سے ہدایت حاصل کرنی چاہی تھی اور قرآن نے ان کی ہدایت نہیں کی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن سے استفتا کرنے کے بجائے فلسفیانہ طریق پر فکر کی اور دو متقابل پہلوؤں میں سے ایک پہلو اختیار کر لیا۔ پھر اپنے اعتقاد کی تائید میں دلائل ڈھونڈنے کے لئے قرآن مجید پر نگاہ ڈالی، جو آیات اپنے موافق مطلب نظر آئیں ان کو تاویل کے خراد پر چڑھا دیا۔ دونوں فریقوں کی جانب سے جو آیات پیش کی گئی ہیں ان کو آپ نے اوپر دیکھ لیا۔ بعض آیات صریح قدر کا حکم لگاتی ہیں جن سے جبر کا پہلو نکالنا ممکن نہیں ہے مگر جبریہ پھر بھی ان کی تاویل کرتے ہیں اور ایسے معنی پہناتے ہیں جن کو عقل سلیم کسی طرح قبول نہیں کرتی۔ یہی حال قدریہ کا ہے۔ وہ جبر کا صریح حکم لگانے والی آیات کو قدر کے مطلب پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں او

اس میں ان کو یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ آیت کے الفاظ کیا کہہ رہے ہیں ۔ اس کا
نتیجہ یہ ہے کہ ہر گروہ کی بحثوں سے صرف وہی شخص مطمئن ہو سکتا ہے جو پہلے سے اپنا
عقیدہ قائم کر چکا ہو اور قرآن مجید سے صرف اس کی تائید چاہتا ہو ۔ رہا وہ شخص جس نے
خود پہلے سے کوئی رائے قائم نہ کی ہو اور جس کی خواہش یہ ہو کہ قرآن حکیم کے مطالعہ سے
کسی نتیجہ تک پہنچے تو وہ جبریہ اور قدریہ کی بحثوں کو پڑھ کر ہرگز مطمئن نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ
کچھ عجب نہیں کہ وہ خود قرآن مجید ہی کی طرف سے بدعقیدہ ہو جائے ۔ اس لیے جس طرح
دونوں فرقوں نے آیات قرآنی کو لے کر ایک دوسرے سے ٹکرایا ہے اور ان سے
دو بالکل متضاد عقیدوں پر استدلال کیا ہے اس کو دیکھ کر ایک ناواقف آدمی اس
بدگمانی سے محفوظ نہیں رہ سکتا کہ خود قرآن مجید ہی کے بیانات میں معاذ اللہ تناقض و
تعارض ہے ۔

تحقیقِ مسئلہ

پچھلے صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اب تک انسان نے اس مسئلہ کو سمجھنے کی جتنی کوششیں کی ہیں وہ سب ناکام ہوئی ہیں۔ ان تمام ناکامیوں کی وجہ صرف ایک ہے یعنی ان ذرائع کا فقدان جس سے انسان اس وسیع کائنات کے نظامِ حکومت، اور اس عظیم الشان سلطنتِ الٰہی کے دستورِ اساسی کو معلوم کر سکے۔ ہمارے سامنے ایک زبردست کارخانہ چل رہا ہے ہم خود اس کارخانے کے کل پرزوں میں سے ایک حقیر پرزہ ہیں اور اس کے دوسرے پرزوں کے ساتھ ہم بھی حرکت کر رہے ہیں۔ بس اتنا ہی ہم کو معلوم ہے۔ رہیں وہ قوتیں جو اس کارخانے کو چلا رہی ہیں، اور وہ قوتیں جن کے ماتحت اس کے کام چل رہے ہیں تو ان تک رسائی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے نہ ہمارے حواس وہاں تک پہنچ سکتے ہیں، اور نہ ہماری عقل اس کے اسرار کو پا سکتی ہے۔ احساس و ادراک سے ماورا حقیقتوں کو چھوڑ دیجیے ہم نے تو ابھی تک کائنات کے ان مظاہر کا بھی پوری طرح احاطہ نہیں کیا ہے جو حدِ

ادراک و حواس سے خارج نہیں ہیں۔ جو کچھ اپنے حواس سے محسوس کر سکتے ہیں اور جو کچھ قیاس و استقراء کے ذریعے سے کسی حد تک ہمارے علم میں آسکا ہے وہ مظاہر کائنات کے لامتناہی سمندر میں ایک قطرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ گویا ہمارے علم اور وسائل علم کو ہمارے جہل اور اسباب جہل کے ساتھ وہی نسبت ہے جو متناہی کو لامتناہی کے ساتھ ہے۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم اس کارخانے کے باطنی نظام اور اس میں اپنی صحیح پوزیشن کو سمجھ سکیں۔ ہمارا خود اپنے ذرائع علم سے اس کو سمجھنا تو درکنار اگر خداوند تعالیٰ کی جانب سے ہمارے سامنے اس کو بیان کیا بھی جاتا تب بھی ہم اپنی محدود عقل سے اس کے معانی کو نہ سمجھ سکتے۔

اب ہمیں اصل سوال کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ سوال یہ تھا کہ قرآن میں مسئلہ جبر و قدر کی طرف جو اشارات کیے گئے ہیں ان میں بظاہر تناقض نظر آتا ہے۔ کہیں بندے کو خود اپنے افعال کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور اسی پر نیک و بد کی تمیز قائم کر کے جزاو سزا کی وعدہ وعید کی گئی ہے۔ کہیں بندے سے قدرتِ فعل کو سلب کر کے تمام افعال کی نسبت خدا کی طرف کر دی گئی ہے کہیں ایک ہی فعل خدا اور بندے کی طرف منسوب کیا گیا ہے، کہیں بندے کو ہدایت قبول کرنے اور ضلالت سے نکلنے کی دعوت اس طرح دی گئی ہے کہ گویا اس میں ترک و اختیار کی طاقت ہے۔ کہیں کہا گیا ہے کہ ہدایت و ضلالت خدا کی طرف سے ہے، خدا ہی گمراہ کرتا ہے اور خدا ہی سیدھے رستے پر ڈالتا ہے کہیں بندے کے لئے مشیت ثابت کی گئی ہے اور کہیں کہہ دیا گیا ہے کہ

بندے کی مشیت خدا کی ہے۔ کہیں شرور و معاصی کو بندے کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہیں ان کا باعث شیطان کو قرار دیا گیا ہے اور کہیں بتایا گیا ہے کہ خیر اور شر سب خدا کی طرف سے ہیں۔ کہیں کہا گیا ہے کہ خدا کے اذن بغیر کوئی کچھ نہیں کر سکتا اور کہیں نافرمان انسانوں کو الزام دیا گیا ہے کہ انہیں خدا نے جو کچھ حکم دیا تھا۔ انہوں نے اس کے خلاف کیا۔ اگر یہ باتیں باہم متناقض ہیں جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے، تو ایسی کتاب کو ہم کتاب الٰہی کیسے کہہ سکتے ہیں جس میں اتنی متناقض باتیں ہوں؛ اور اگر ان میں تناقض تسلیم نہیں کیا جاتا تو بتایا جائے کہ ان کے درمیان توفیق و تطبیق کی کیا سبیل ہے؟

امور ماوراء طبیعت کے بیان سے قرآن کا اصل مقصد

اس سوال پر غور کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قرآن کریم میں صرف مسئلہ جبر و قدر، بلکہ جملہ امور ماوراء طبیعت کی طرف جو اشارات کیے گئے ہیں ان کا اصل مقصد ان امور کی حقیقت بتانا اور اسرار الٰہی پر سے پردہ اٹھانا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اول تو بسیط حقیقتیں جو اس وسیع کائنات کے ورق ورق پر لکھی ہوئی ہیں اپنی تفصیلات کے ساتھ نہ وہ کسی کتاب میں سما سکتی ہیں، جسے انسان پڑھ سکتا ہو اور نہ کوئی انسانی بولی ان کے بیان کی متحمل ہو سکتی ہے۔ ان کے لیے ازلی و ابدی زندگی درکار ہے ان کے لیے لامتناہی دفتر چاہئیں، ان کو پڑھنے کے لیے ازلی و ابدی زندگی درکار ہے، ان کو بیان کرنے کے لیے غیر ملفوظ عقلی کلام اور ان کو سننے کے لیے بے آواز عقلی سامع کی حاجت ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ
أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا (کہف ۱۰۹)

"اے پیغمبر ان سے کہو اگر سمندر میرے پروردگار کے کلمات کو لکھنے کے لیے روشنائی بن جاتا تو وہ ان کے ختم ہونے سے پہلے ہی خرچ ہو جاتا خواہ ہم ایک اور سمندر اس کی مدد کے لیے لے آتے۔"

دوسرے اگر ان کو بیان کیا بھی جاتا، تو جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، انسان اپنے ان محدود قوائے ذہنی سے جو اسے عطا کیے گئے ہیں، ان کو سمجھ نہ سکتا۔ انسان کی عقل کا حال یہ ہے کہ اگر ارسطو اور فیثا غورث کے زمانہ میں کوئی شخص بیسوی صدی عیسوی کے ٹیلیفون، سینما، ریڈیو اور ہوائی جہاز کی تفصیلات بیان کرتا تو سب سے پہلے وہی لوگ اس پر جنون کا حکم لگاتے ہیں جو آج تک سرآمد عقلا سمجھے جاتے ہیں اور اگر آج بیسویں صدی میں ان چیزوں کی کوئی تشریح کی جائے جو اب سے ہزار برس بعد دنیا میں ظاہر ہونے والی ہیں تو ہمارے بڑے سے بڑے فلسفی اور حکیم بھی اس کو نہ سمجھ سکیں گے۔ یہ ان چیزوں کا حال ہے جن کو جاننے اور سمجھنے کی استعداد انسان میں بالقوت موجود ہے اور فرق صرف قوت و فعل کا ہے۔ مگر جن امور کو جاننے اور سمجھنے کی استعداد ہی سرے سے اس میں نہیں ہے، جو اس کے تصور میں کسی طرح سما ہی نہیں سکتے، ان کو بیان کرنے سے آخر کیا فائدہ مترتب ہو سکتا تھا؟ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ
مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ج
(بقرہ-۲۵۵)

جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے سب کچھ وہ جانتا
ہے مگر لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے بجز
ان باتوں کے جن کا علم وہ خود ان کو بخشنا چاہے۔ اس کا اقتدار آسمانوں
اور زمین سب پر چھایا ہوا ہے۔

پس اس قسم کے امور کی طرف قرآن میں جو اشارات کیے گئے ہیں وہ رازِ حقیقت بتانے کے لیے نہیں بلکہ ان مقاصد کو مدد پہنچانے کے لیے ہیں جن کا تعلق انسان کے اخلاقی اور عملی مفاد سے ہے، اگرچہ بعض مقامات پر ان کے ذریعہ سے حقیقت شناس نظر اور اعلیٰ روحانی بصیرت رکھنے والوں کو اسرار الٰہی کا بھی کچھ تھوڑا سا علم بخش دیا جاتا ہے، اور کہیں بیان کا سیاق اور موقع و محل کا اقتضاء ایسے اشارات کی طرف بھی داعی ہوگیا ہے جن کو غور و تامل اور فکر صحیح سے ہم تھوڑا بہت سمجھ سکتے ہیں۔

مسئلہ قضا و قدر کے بیان کا منشاء

اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ قضا و قدر کے مسئلہ پر جو اشارات کلام اللہ میں آئے ہیں ان کا اصل مقصد یہ ہے ہی نہیں کہ ہم سے وہ چیز بیان کی جائے جس کے سمجھنے کی قابلیت و استعداد ہم میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اصل میں جو کچھ مقصود ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان میں قناعت، بلند نگاہی، توکل علی اللہ، صبر و استقامت اور دنیوی طاقتوں سے بے خوفی پیدا کی جائے اس میں ایسی اخلاقی قوت بھر دی جائے جس کی موجودگی میں مایوسی، پریشانی

حسد، رشک اور لالچ اس کے پاس پھٹکنے نہ پائیں، اور وہ اس قوت کے ذریعہ سے حق و صداقت اور نیکی کے طریق پر قائم رہے، اس کی طرف دوسروں کو دعوت دے، اس کی خاطر سخت سے سخت مشکلات کا مقابلہ کرے، اس کی راہ میں جتنی آزمائشیں پیش آئیں ان میں ثابت قدم رہے، نہ خدا کے سوا کسی سے مضرت پہنچنے کا اندیشہ کرے اور نہ کسی سے ذرہ برابر فائدہ کی امید رکھے، نہ بے سروسامانی میں ہمت ہارے، نہ سروسامان پر بے جا اعتماد کرے، نہ زندگی کی ناکامیوں پر شکستہ خاطر ہو اور نہ کامیابیوں سے مغرور ہو کر سرکشی پر اُتر آئے۔ مثال کے طور پر آیاتِ ذیل ملاحظہ ہوں جن سے اصل مقصود پر روشنی پڑتی ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بقرہ-۱۶۵)

"لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی خدا سے ہونی چاہئے حالانکہ جو لوگ ایمان لانے والے ہیں۔ وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ کاش ظالموں کو وہ بات سوجھ جاتی جسے یہ عذاب سامنے دیکھ کر محسوس کریں گے کہ تمام قوت کا مالک صرف اللہ ہے۔"

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ (فاطر-۱۵)

لوگو! تم سب اللہ کے محتاج ہو اور در اصل بے نیاز اور ستودہ صفات

تو اللہ ہی ہے۔"

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ۝ (المزمل)

"اپنے پروردگار کا نام لے اور سب سے ٹوٹ کر اسی کا ہو جا۔ وہ مشرق اور مغرب سب کا مالک و مربی ہے، اس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پس تو اسی کو اپنا کارساز بنا لے۔"

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (البقرہ۔ ۱۰۷)

"کیا تو نہیں جانتا کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت کا مالک خدا ہی ہے اور اس کے سوا تم لوگوں کا کوئی حامی و مددگار نہیں ہے۔"

إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (آل عمران - ۱۶۰)

اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ جو ایمان لانے والے ہیں ان کو تو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ

شَيْءٍ قَدِيْرٌ (آل عمران - ۲۶)

"کہو کہ خدایا، ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت چھینتا ہے، جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے تو یقیناً ہر چیز پر قادر ہے"

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران - ۷۳،۷۴)

"کہو کہ فضیلت اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور وہ بہت کشادہ دست و صاحب علم ہے، اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہے مخصوص کرے"

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (الشوریٰ - ۱۲)

"آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں، جسے چاہتا ہے کشادگی کے ساتھ رزق عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ایک اندازہ سے نپا تُلا دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کے حال سے خوب واقف ہے"

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ (النحل - ۷۱)

"اور اللہ ہی ہے جس نے تم کو رزق میں ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے"

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ

یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِہٖ ؕ وَھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ۝ (یونس - ۱۰۷)

اگر اللہ تجھ کو نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس نقصان کو دور کرنے والا نہیں، اور اگر وہ تجھے فائدہ پہنچائے تو کوئی اس کے فضل کو پھیر دینے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے وہ جس کو چاہتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے وہی بخشنے والا مہربان ہے

وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ (بقرہ - ۱۰۲)

وہ اپنے جادو سے کسی کو خدا کے اذن کے بغیر نقصان نہیں پہنچا سکتے

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا ھُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (توبہ - ۵۱)

کہو کہ ہم پر ہرگز کوئی مصیبت نہیں آسکتی بجز اس کے جو اللہ نے ہمارے نصیب میں لکھ دی ہے۔ وہی ہمارا مولے ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

وَمَا کَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ کِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران - ۱۴۵)

کوئی شخص اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت مقرر ہے اور پہلے سے لکھا ہوا ہے۔

یَقُوْلُوْنَ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا ھٰھُنَا ؕ قُلْ لَّوْ کُنْتُمْ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْھِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِھِمْ (آل عمران - ۱۵۴)

"وہ کہتے ہیں کہ اگر تدبیر میں ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے ان سے کہو اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن لوگوں کے نصیب میں مارا جانا لکھ دیا گیا تھا وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے"

پس تقدیر پر عقیدہ رکھنے کی جو تعلیم قرآن میں دی گئی ہے اس کا اصل مقصود یہ ہے کہ انسان دنیا کی کسی طاقت کو نفع و نقصان کا مالک نہ سمجھے بلکہ صرف خدا ہی کو فاعل و مؤثر اور نافع و ضار سمجھے اور اپنے سب معاملات میں اسی پر بھروسہ کرے مخلوقات کے سامنے ذلت نہ اختیار کرے اور اگر راحت میسر ہو تو اس پر پھولے نہیں، غرور و نخوت کو اپنے نفس میں جگہ نہ دے اور خدا کی زمین پر سرکشی و تکبر نہ اختیار کرے۔ یہی بات ہے جو سورۂ حدید کو ع ۳ میں بیان کی گئی ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ (الحدید - ۲۳)

"جو مصیبت بھی زمین میں آتی ہے، یا خود تم پر نازل ہوتی ہے وہ پیش آنے سے پہلے ہی ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے اور یہ اللہ کے لیے سہل سی بات ہے۔ تم کو بات اس لیے بتائی گئی کہ جو کچھ نقصان تم کو پہنچے اس پر شکستہ نہ ہو اور جو کچھ خدا تم کو عطا کرے اس پر اترا نہ جاؤ۔ اللہ کسی اکڑنے والے خود پسند کو دوست نہیں رکھتا۔"

عقیدۂ تقدیر کا فائدہ عملی زندگی میں!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی زندگی کے تمام معاملات میں یہی روح پھونکنے کی کوشش فرمایا کرتے تھے کیونکہ اس سے اخلاق پر خاص اثر پڑتا ہے۔ اگر لوگوں کے دلوں میں یہ چیز بیٹھ جائے تو بڑے بڑے تمدنی و سیاسی مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں، بلکہ پیدا ہی نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر دو حدیثیں ملاحظہ ہوں۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ تَسْأَلُ طَلَاقَ أُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا فَإِنَّمَا لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا[1]

"کسی عورت کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اپنی دوسری بہن (یعنی سوکن) کو طلاق دینے کا مطالبہ اس خیال سے کرے کہ اس کے تمتعات اور حظوظ میں کوئی دوسرا شریک نہ رہے اور رزق کا پیالا تنہا اس کے لیے خالی ہو

---

[1] بخاری کتاب النکاح باب الشروط التی لا تحل فی النکاح۔ اسی کے قریب بیہقی اور ابونعیم اصبہانی نے دوسرے طریقوں سے نقل کیا ہے۔ علامہ ابن عبدالبر لکھتے ہیں کہ اہل علم کے نزدیک یہ حدیث ان تمام احادیث میں سب سے بہتر ہے جو تقدیر کے مسئلہ میں منقول ہیں اس کا منشا یہ ہے کہ اگر شوہر عورت کی بات مان بھی لے اور اس بیوی کو طلاق بھی دے دے جس کے متعلق وہ عورت یہ گمان کرتی ہے کہ وہ اس کے رزق میں شریک ہو جائے گی تب بھی اس تدبیر سے اس کو کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کو صرف اتنا ہی حصہ ملے گا جتنا خدا نے اس کے لیے لکھ دیا ہے۔ خواہ شوہر اس کی شرط قبول کرے یا نہ کرے۔

جائے۔ اس لیے کہ بہر صورت اس کو وہی ملے گا جو اس کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک غزوہ میں بہت سی لونڈیاں ہمارے ہاتھ آئیں اور ہم نے ان سے تمتع کیا، مگر اس خیال سے کہ اولاد نہ ہو عزل[1] کرنے لگے۔ پھر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا حکم پوچھا۔ آپؐ نے سنتے ہی فرمایا:

اَوَ اِنَّکُمْ لَتَفْعَلُوْنَ؟

"کیا واقعی تم ایسا کرتے ہو؟"

یہی سوال آپؐ نے تین مرتبہ دہرایا، پھر فرمایا۔

مَا مِنْ نَسَمَةٍ کَائِنَةٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ اِلَّا هِیَ کَائِنَةٌ

"قیامت کے دن تک جو بچے پیدا ہونے ہیں وہ تو ہو کر ہی رہیں گے"

ان دونوں حدیثوں میں جن اصولوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اگر ان کو وسعت کے ساتھ ہم اپنی زندگی کے معاملات میں استعمال کریں تو وہ معاشی کش مکش اور مزاحمت جس نے دنیا سے سکون و اطمینان چھین لیا ہے کس قدر جلد ختم ہو جائے نہ کوئی کسی کو اپنے رزق کا چھیننے والا سمجھے اور نہ اپنے رزق کی حفاظت کے لیے کسی کی مزاحمت کرے، نہ سرمایہ دار اور مزدور کا سوال پیدا ہو اور نہ کسان اور زمیندار کا، نہ کروگر اور جیل زہاروف پیدا ہوں نہ لینن اور اسٹالن، نہ معاشی اور تمدنی مشکلات کو حل کرنے کے لیے اسقاط حمل اور منع حمل کی طرف رجوع کیا جائے اور

---

[1] العزل النزع بعد ایلاج لینزل خارج الفرج

[2] بخاری کتاب النکاح باب العزل

نہ اللہ کے انتظام میں اصلاح کی کوشش کی جائے۔

یہ اور ایسے ہی بے شمار اخلاقی اور عملی فوائد ہیں جو قضا و قدر کی اسلامی تسلیم سے حاصل ہوتے ہیں اور انہی فوائد کا حصول اصل مقصود بھی تھا۔ مگر ہماری بدقسمتی کہ ہم نے اس کے عملی اور اخلاقی پہلو کو نظر انداز کر کے اپنی ساری توجہات فلسفیانہ پہلو کی طرف پھیر دیں اور اپنے مذاقِ طبیعت کے مطابق کلام اللہ اور کلام رسول سے ان مسائل فلسفہ کو حل کرنے لگے جو کلام الناس سے ہم نے اخذ کئے گئے تھے حالانکہ نہ قرآن مجید ہم کو مابعد الطبیعیات کی تعلیم دینے کے لیے اتارا گیا تھا، نہ رسول عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ آپ فلسفہ کے پروفیسر کا کام انجام دیں اور نہ خدا اور رسول نے کبھی اس کو پسند کیا کہ ہم اپنی زندگی کے عملی معاملات کو چھوڑ کر ان مابعد الطبیعی مسائل میں الجھ جائیں جن سے دین و دنیا کا کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

تناقض کی تحقیق

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد اب اس سوال کی طرف آئیے کہ قرآن مجید خاص تعت دیر کے مسئلہ پر بحث کئے بغیر جو مختلف اشارات ضمناً دوسرے مباحث کے سلسلہ میں اس کی جانب کرتا ہے آیا ان میں حقیقتاً کوئی تناقض ہے بھی یا نہیں؟

اگر کسی شے کو مختلف علتوں کی جانب منسوب کیا جائے تو اس پر تناقض کا حکم صرف اس صورت میں لگایا جا سکتا ہے جب کہ اس کی صرف ایک ہی

علت ہو لیکن اگر اس کی متعدد علتیں ہوں تو ایسی صورت میں اس کو کبھی ایک علت کی جانب اور کبھی دوسری علت کی جانب نسبت دینے میں کوئی تناقض نہ ہوگا۔ مثلاً اگر ہم کبھی یہ کہیں کہ کاغذ کو پانی نے ترکیا اور کبھی یہ کہ اسے آگ نے ترکیا اور کبھی یہ کہ اسے مٹی نے ترکیا تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نے متناقض باتیں کہی ہیں، کیونکہ کاغذ کی تری ایک ہی علت کی طرف منسوب ہوسکتی ہے لیکن اگر ہم کبھی یہ کہیں کہ ملک کو بادشاہ نے فتح کیا اور کبھی یہ کہ ملک کو سپہ سالار نے فتح کیا، اور کبھی یہ کہ اسے فوج نے فتح کیا اور کبھی یہ کہ اسے سلطنت نے فتح کیا اور کبھی اس فتح کو فرداً فرداً فوج کے ہر سپاہی کی طرف منسوب کریں، تو ان مختلف اقوال پر تناقض کا حکم نہیں لگایا جاسکتا اس لیے کہ فتح کا یہ واقعہ مجموعی طور پر ان سب کی طرف بھی منسوب ہوسکتا ہے اور ایک ایک وجہ سے ان علتوں میں سے ہر علت کی طرف بھی۔

پھر اگر شے میں متعدد علتوں کی تاثیرات اس طرح خلط ملط ہوں کہ مخاطب کی عقل کسی طور سے اس کے اندر ہر علت کی تاثیر کو جدا جدا کرکے ہر ایک کا حصہ الگ الگ متعین نہ کرسکتی ہو، اور نہ ایسے کسی تجزیہ و تحلیل اور اس طرح کے کسی حساب کو سمجھ سکتی ہو، تو اس صورت میں متکلم کے لیے صحیح انداز بیان یہی ہوسکتا ہے کہ وہ اجمال کے طور پر اس کو ایک ایک علت کی طرف منسوب کرے اور مخاطب اگر کسی غلط فہمی کی بنا پر اس شے کو صرف ایک ہی علت کی جانب نسبت دے رہا ہو تو اس کی تردید کردے۔ مثال کے طور پر اسی فتح کے واقعہ کو لیجیے۔ اس میں بادشاہ، سپہ سالار، فوج، سلطنت اور فرداً فرداً ہر سپاہی کی قوتیں شریک

ہیں، مگر وہ اس طرح باہم ملی جلی ہیں کہ ہم کسی تجزیہ و تحلیل اور کسی حساب سے یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ اس واقعہ کے اندر ہر ایک کا حصہ کس قدر ہے۔ اس لیے زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اس واقعہ کو ان میں سے ہر ایک کی طرف بسبیل اجمال نسبت دی جائے اور اگر کوئی شخص ان میں سے محض کسی ایک کی طرف اس کو حصر و تعیین کے طور پر منسوب کر رہا ہو تو کہہ دیا جائے کہ اس کا قول غلط ہے۔

یہی حال انسان کے افعال کا ہے۔ ہر فعل جو انسان سے سرزد ہوتا ہے اس میں متعدد اسباب شامل ہوتے ہیں، اور اس کے ظہور و صدور میں ہر سبب کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر میں اس وقت کچھ لکھ رہا ہوں۔ میرے اس فعل کتابت کا تجزیہ کیجئے تو اس میں اسباب کا ایک پورا سلسلہ آپ کو نظر آئے گا۔ مثلاً لکھنے کے لیے میرا اختیار و ارادہ میرے اندر جو بے شمار ذہنی اور جسمانی قوتیں موجود ہیں ان سب کا اس ارادہ کے تحت کام کرنا اور خارجی قوتوں کا جو بے حد و حساب ہیں اور جن سے بہت سی قوتیں میرے علم میں بھی نہیں ہیں، میری مساعدت کرنا۔

پھر ان اسباب کی الگ الگ تحلیل کیجئے۔ یہ بے شمار خارجی قوتیں جو اس وقت اس فعل میں میری مساعدت کر رہی ہیں ان میں سے کسی کو بھی نہ میں نے بنایا ہے، نہ فراہم کیا ہے، نہ میں ان پر اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ انہیں اپنی مساعدت پر مجبور کر سکوں۔ وہ خدا ہی ہے جس نے ان کو اس طور پر بنایا اور اس طرح فراہم کر دیا ہے کہ جب میں لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یہ ساری قوتیں میری مساعدت کرنے لگتی ہیں اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ میری مساعدت نہ کریں تو میں لکھ نہیں سکتا۔

اسی طرح جب میں خود اپنے اوپر نگاہ ڈالتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرا موجود اور زندہ ہونا، میرا حسنِ تقویم پر ہونا، میرے جسم کے ان اعضاء کا جو کتابت کے فعل میں حصہ لیتے ہیں صحیح وسلامت ہونا، میرے اندر ان طبیعی قوتوں کا موجود ہونا جن سے میں اس فعل میں کام لیتا ہوں، اور میرے دماغ میں حافظہ، تفکر، علم اور دوسری بہت سی چیزوں کا پایا جانا، ان میں سے کوئی شے بھی نہ میری کاریگری کا نتیجہ ہے، نہ میرے اختیار میں ہے۔ ان سب کو بھی اسی خدا نے اس طور پر بنایا ہے کہ جب میں لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں تو یہ سب چیزیں میرا ساتھ دیتی ہیں اور اگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی شے میرا ساتھ نہ دے تو میں کتابت میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

رہا میرا اختیار و ارادہ تو اس کی حقیقت بھی میں نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پہلے کچھ خارجی اسباب اور کچھ باطنی اسباب سے میرے اندر لکھنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، پھر میں غور کرتا ہوں کہ لکھوں یا نہ لکھوں۔ پھر دونوں پہلوؤں کے درمیان موازنہ کرنے کے بعد میں لکھنے کے پہلو کو اختیار کرتا ہوں اور جب میرا میلان فعل کی جانب قوی ہوتا ہے تو میں فعل کا ارادہ کر کے اپنے اعضاء کو اس کے لیے حرکت دیتا ہوں۔ اس خواہش سے لیکر اقدامِ فعل تک جتنی چیزیں ہیں ان میں سے کسی چیز کا بھی میں خالق نہیں ہوں، بلکہ مجھے اب تک یہ بھی پوری طرح معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ خواہش اور اقدامِ فعل کے درمیان کتنی باطنی قوتیں کام کرتی ہیں اور اس کام میں ان کا کتنا حصہ ہے۔ مگر یہ بات وجدانی طور پر میں اپنے اندر پاتا ہوں کہ خواہش اور اقدامِ فعل کے درمیان کوئی مقام ایسا ضرور ہے جہاں

میں فعل اور ترک فعل میں سے کسی ایک چیز کو آزادانہ اختیار کرتا ہوں اور جب میں آزادی کے ساتھ کسی ایک پہلو کو اختیار کر لیتا ہوں تو مجھے یہ قدرت اپنے اندر محسوس ہوتی ہے کہ جس پہلو کو میں نے اختیار کیا ہے اس کے لحاظ سے اپنے وسائل داخلی اور اسباب خارجی کو استعمال کروں۔ میں اپنے اس اختیار اور آزادی ارادہ کو کسی دلیل سے ثابت نہیں کر سکتا۔ مگر کوئی دلیل میرے اور کسی انسان کے ذہن سے اس وجدانی احساس کو دور نہیں کر سکتی حتیٰ کہ جو شخص انتہا درجہ کا جبریہ ہے اس کا وجدان بھی اس احساس سے خالی نہیں ہے، خواہ وہ اپنے فلسفیانہ مسلک کی خاطر کتنی ہی شدت کے ساتھ اس کا انکار کرتا ہو۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ فعل کتابت کے صدور میں جتنے اسباب و علل کام کرتے ہیں ان کو تین جدا جدا سلسلوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ وہ خارجی اور داخلی اسباب جن کا فراہم ہونا کتابت کا ارادہ کرنے سے پہلے ضروری ہے۔

۲۔ میرا کتابت کو اختیار کر کے اس کا ارادہ کرنا۔

۳۔ وہ خارجی اور داخلی اسباب جن کی مساعدت کے بغیر لکھنے کے فعل کا صادر ہونا ممکن نہیں ہے۔

ان تینوں سلسلوں میں سے پہلے اور تیسرے سلسلہ میں جتنے اسباب ہیں ان کے متعلق تو اوپر کہا جا چکا ہے کہ ان کو خدا نے فراہم کیا اور ساز گار بنایا ہے اور ان میں سے کسی پر بھی میری حکومت نہیں ہے۔ اس لیے ان کے اعتبار سے میرا فعل کتابت خدا ہی کی طرف منسوب ہوگا جس کی "توفیق" اس کام میں میرے شامل

حاصل ہوتی ہے۔ رہی بیچ کی کڑی تو وہ ایک لحاظ سے میری طرف منسوب ہوگی کیونکہ وہاں میں نے ایک طرح کا آزادانہ اختیار و ارادہ استعمال کیا ہے اور ایک پہلو سے وہ خدا کی طرف منسوب ہوگی جس نے اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر مجھ میں یہ قوت پیدا کی کہ ارادہ کروں اور آزادی کے ساتھ اپنا اختیار استعمال کروں۔

یہ تو تھا مجرد فعل کا حال جو اپنی حقیقت میں بجز ایک حرکت کے اور کچھ نہیں ہے لیکن انسانی افعال بعض اضافی اور اعتباری حیثیتوں سے اپنے اندر دو پہلو رکھتے ہیں۔ ایک خیر کا پہلو اور دوسرا شر کا پہلو۔ مجرد فعل پر نہ خیر کا حکم لگایا جاسکتا ہے اور نہ شر کا۔ البتہ انسان کی نیت اس کو شر بھی بنا سکتی ہے اور خیر بھی (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ) مثال کے طور پر میں راستے میں ایک اشرفی پڑی ہوئی دیکھتا ہوں اور اُسے اٹھا لیتا ہوں۔ میرا اس کو اٹھا لینا محض ایک حرکت ہے، جو نیک و بد دونوں حیثیتوں سے خالی ہے لیکن اگر اس اٹھا لینے کے فعل میں میری نیت یہ ہے کہ میں دوسرے کے مال سے بلا کسی حق کے خود فائدہ اٹھاؤں تو یہ شر ہے اور اگر میری نیت یہ ہے کہ اس کے مالک کو تلاش کر کے اسے واپس دے دوں تو یہ خیر ہے۔ صورت اوّل میں میری نیت کے ساتھ ایک اور قوت کی تحریک بھی شامل ہوگی جس کو شیطان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور میرا یہ فعل تین علتوں کی طرف منسوب ہوگا۔ ایک خدا، دوسرا شیطان، تیسرا خود میں۔ صورت دوم میں اس فعل کی نسبت دو علتوں کی جانب ہوگی۔ ایک خدا دوسرا میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہم ہر انسانی فعل کو دو یا تین علتوں کی طرف منسوب کر سکتے ہیں مگر یہ کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا کہ فعل میں ان علتوں

کی تاثیر کس کس مقدار میں ہے خصوصاً یہ حساب اس حیثیت سے اور بھی پیچیدہ ہوجاتا ہے کہ ان تاثیرات کا تناسب تمام انسانوں کے افعال میں یکساں نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے فعل میں جداگانہ ہے، اس لیے کہ ہر انسان کے اندر اس کے آزادانہ اختیار اور اس کی مجبوریوں کی مقداریں مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی مبداء فیاض سے زیادہ زبردست قوت تمیز، زیادہ صحیح قوتِ فیصلہ، ملکوتیت کی جانب زیادہ قوی میلان، اور شیطانی وساوس کا مقابلہ کرنے کی زیادہ طاقت لے کر آیا ہے، اور کوئی کم اور اسی کمی و زیادتی پر جس کا تناسب ہر شخص کے اندر مختلف ہے افعال میں انسان کی شخصی ذمہ داری کے کم یا زیادہ ہونے کا انحصار ہے۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ افعال میں انسان، خدا اور شیطان کی تاثیرات کا کوئی ایسا تناسب بتایا جا سکے جو عمومیت کے ساتھ تمام انسانی افعال میں پایا جاتا ہو۔

پس جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، انسانی افعال کو ان کی علتوں کی طرف نسبت دینے کی صحیح صورت بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اجمالی طور پر ان کو یا تو بیک وقت تمام علتوں کی طرف منسوب کیا جائے یا کبھی ایک علت کی جانب اور کبھی دوسری کی جانب، اور اگر کوئی شخص غلط فہمی سے ان کو صرف ایک علت کی طرف نسبت دے کر دوسری علتوں کی نفی کرتا ہو تو اس کی تردید کر دی جائے۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جو قرآن مجید میں اختیار کیا گیا ہے۔ اگر آپ ان اشارات کا تتبع کریں جو قرآن مجید میں مسئلہ جبر و قدر کی طرف کئے گئے ہیں، تو ان کو حسب ذیل عنوانات کے تحت مرتب کر سکتے ہیں۔

(۱) تمام امور کی نسبت خدا کی طرف:

وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ط
قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا
يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (النساء ۷۸)

اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے
اور اگر برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ تیری طرف سے ہے۔ کہو سب
کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ کوئی بات نہیں
سمجھتے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ط
وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (انعام ۱۷)

اور اگر اللہ تجھے کوئی نقصان پہنچائے تو اسے دور کرنے والا اس کے
سوا کوئی نہیں اور اگر تجھے نفع پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ط وَهُوَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ط (ابراہیم ۴)

پس اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت
دیتا ہے اور وہ سب پر غالب اور دانا ہے۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ط وَمَا يُعَمَّرُ
مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ط (فاطر ۱۱)

نہیں حاملہ ہوتی کوئی مادہ اور نہ بچہ جنتی ہے مگر وہ اللہ کے علم میں

ہوتا ہے اور نہیں دراز ہوتی کسی کی عمر اور نہ کم ہوتی ہے مگر وہ ایک کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔"

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (الشوریٰ - ۱۲)

"آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اس کے قبضے میں ہیں، جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے نپا تلا کر دیتا ہے اور وہ ہر چیز سے واقف ہے۔"

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (الشوریٰ ۲۷)

اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے رزق کشادہ کر دیتا وہ زمین میں سرکش ہو جاتے مگر وہ ایک اندازے سے نازل کرتا ہے۔ جو وہ چاہتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے واقف ہے اور سب کچھ دیکھتا ہے۔

(۲) فعل کی نسبت بندے کی طرف :-

اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى - (والنجم - ۳۸-۳۹)

یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر جس کی وہ سعی کرے۔"

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (بقرہ - ۲۸۶)

"اللہ کسی نفس کو مکلف نہیں کرتا مگر اس کی قدرت کے لحاظ سے جو کچھ اس نے کمایا اس کا فائدہ اسی کے لیے ہے اور جو گناہ اس نے سمیٹا اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔"

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (مزمل ۱۹)

"یہ تو ایک یاد دہانی ہے، پھر جس کا جی چاہے اپنے رب کا راستہ لے لے"

(۳) فعلِ خیر کی نسبت بندے کی طرف:

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (آل عمران - ۵۷)

"رہے وہ لوگ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو اللہ انکے پورے اجر انہیں دے گا اور وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا"

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۚ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ (فاطر ۱۸)

"تم بہر حال انہی لوگوں کو متنبہ کر سکتے ہو جو اپنے خدا سے بے دیکھے ڈرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ جو شخص پاکیزگی اختیار کرتا ہے اپنے ہی لیے کرتا ہے اور سب کو خدا کی طرف پلٹنا ہے۔"

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (الزمر - ۳۳)

"اور جو شخص سچائی لایا اور جس نے سچائی کو مانا ایسے ہی لوگ پرہیزگار ہیں"

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (احقاف - ۱۳)

"جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے، ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔"

(۴) فعل شر کی نسبت خدا کی طرف۔

أَتُرِيدُونَ أَنْ تَهْدُوا مَنْ أَضَلَّ اللَّهُ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ سَبِيلًا ۝ (النساء - ۸۸)

"کیا تم چاہتے ہو کہ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اسے تم راستہ دکھاؤ حالانکہ جسے اللہ نے گمراہ کر دیا، اس کے لیے تم ہرگز راستہ نہیں پا سکتے۔"

وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۝ (مائدہ - ۴۱)

جسے اللہ نے فتنے میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو اسے تم اللہ سے کچھ بھی نہیں بچا سکتے - یہ وہ لوگ ہیں جنکے دلوں کو اللہ ہی نے پاک کرنا نہ چاہا۔"

وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَاءِ كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ اللَّهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ (انعام - ۱۲۶)

اور جسے اللہ گمراہ کرنے کا ارادہ کرے اس کے سینے کو ایسا تنگ کرتا ہے گویا وہ آسمان میں چڑھا جا رہا ہے - اس طرح اللہ ناپاکی کو ان لوگوں

ڈالتا ہے جو ایمان نہیں لاتے "۔

وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا (بنی اسرائیل - ۴۶)

" اور ہم نے اُن کے دلوں پر غلاف چڑھا دیئے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس کلام کو نہیں سمجھتے اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی ہے اور اُن کا حال یہ ہے کہ جب تم قرآن میں اکیلے اللہ کا ذکر کرتے ہو تو وہ نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں "۔

(۵) فعل شر کی نسبت شیطان کی طرف :

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ (بقرہ - ۲۶۸)

شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور تم کو شرمناک افعال کا حکم دیتا ہے "

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُوْنَ (النمل - ۲۴)

اور شیطان نے ان کے بُرے اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا، اور راہ راست سے روک دیا - اس وجہ سے وہ راستہ نہیں پاتے۔

(۶) فعل شر کی نسبت بندوں کی طرف :

وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (النساء - ۷۹)

اور برائی جو تمہیں پیش آتی ہے وہ تمہاری اپنی وجہ سے ہوتی ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ

تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ (بقرہ ۶)

"حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اب ان کے لیے یکساں ہے خواہ تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ماننے والے نہیں"

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (بقرہ - ۳۹)

"اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا وہ اہل دوزخ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے"

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (حٰمٓ السجدہ - ۱۷)

"رہے ثمود تو ہم نے انہیں راستہ دکھایا مگر انہوں نے اندھے بن کر چلنے کو سیدھی راہ اختیار کرنے پر ترجیح دی پس ایک زبردست کڑکے نے انہیں آلیا جس میں ذلت کی سزا تھی۔ اور یہ ان کی بُری کمائی کا نتیجہ تھا"

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ (التحریم - ۷)

"اے وہ لوگو! جنہوں نے کفر کیا تھا! آج معذرت نہ پیش کرو تم کو ویسا ہی بدلہ تو دیا جائیگا جیسے تم عمل کرتے تھے"

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ۝ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝ (الفجر ۲۰-۱۷)

"ہرگز نہیں، تم یتیم کو عزت نہیں دیتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں ابھارتے اور مردوں کی میراث حق ناحق کھاتے ہو اور مال کی محبت میں سخت حریص ہو"

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال - ۸)

اور جس نے ذرہ برابر برائی کی وہ اسے دیکھ لے گا"

(۷) خیر کی ابتدا انسان کی جانب سے اور تکمیل خدا کی جانب سے:

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ اَنَابَ ۝ (الرعد)

"کہو اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اپنی طرف آنے کا راستہ بتاتا ہے صرف اس شخص کو جو اس کی طرف رجوع کرے"

(۸) شر کی ابتدا انسان کی جانب سے اور تکمیل خدا کی جانب سے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى (النساء ۱۵)

اور جو کوئی ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت کرے اور اہل ایمان کی راہ کے بجائے دوسری راہ چلے تو اسے ہم اسی راستہ پر موڑ دیتے ہیں جس پر وہ خود مڑ گیا۔

(۹) پھر جہاں انسان نے اپنے گناہ کی ذمہ داری خدا پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جانا چاہا وہاں اس کی تردید کر دی گئی:

وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (الزخرف - ۲۰)

اور انہوں نے کہا کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان فرشتوں کی پرستش نہ کرتے لیکن ان کو اس معاملہ (مشیت الٰہی) کا کوئی علم نہیں ہے وہ محض اٹکل سے یہ باتیں کہتے ہیں۔"

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ (الاعراف ۲۸)

"اور جب کبھی انہوں نے کوئی فحش کام کیا تو کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور اللہ نے ہم کو اس کا حکم دیا ہے۔ اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ اللہ بری باتوں کا حکم نہیں دیتا کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو جن کا تم کو علم نہیں ہے"

(۱۰) اور جہاں انسان نے اپنی ہی تدبیر کو سب کچھ سمجھا اور تقدیر الٰہی کا انکار کیا وہاں اس کی بھی تردید کر دی گئی۔

يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ

(آل عمران - ۱۵۴)

وہ کہتے ہیں اگر معاملات کے طے کرنے میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہوتا تو ہمارے آدمی وہاں (میدانِ جنگ میں) نہ مارے جاتے۔ اے پیغمبر ان سے کہو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لیے مارا جانا لکھ دیا گیا تھا وہ اپنے مرنے کی جگہ پر خود جا پہنچتے۔"

حقیقت کی پردہ کشائی

پچھلی بحث سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ قرآن مجید میں مسئلہ جبر و قدر کے متعلق جو اشارات مختلف مواقع پر کیے گئے ہیں ان میں درحقیقت کوئی تناقض و تعارض نہیں ہے لیکن ایک سوال پھر بھی باقی رہ گیا، اور وہ یہ ہے کہ مخلوقات عالم میں انسان کی وہ کون سی امتیازی حیثیت ہے جس کے لحاظ سے ایک طرف تو وہ تمام موجودات کی طرح خدا کا محکوم ہے، قوانین خداوندی میں جکڑا ہوا ہے مجبور ہے اور دوسری طرف اپنے افعال میں خود مختار بھی ہے، اپنے اعمال کا ذمہ دار بھی ہے، اپنی حرکات و سکنات کے لیے جواب دہ بھی ہے اور جزا و سزا کا مستحق بھی ہے؟ نیز جب انسان کا حال یہ ہے اور اس کی زندگی میں جبر و اختیار اس طرح ملے جلے ہیں، تو عدل کیونکر ممکن ہے؟ اس لیے کہ صحیح انصاف کے ساتھ جزا و سزا کا فیصلہ کرنا بغیر اس تحقیق کے ممکن نہیں ہے کہ انسان کے افعال کی ذمہ داری خود اس پر کس حد تک ہے، اور ذمہ داری کی تشخیص بغیر یہ معلوم کیے نہیں ہو سکتی کہ اس کے افعال میں اس کے آزادانہ اختیار کا کتنا حصہ ہے۔ اس

مسئلہ کی تحقیق کے لیے جب ہم قرآن مجید پر نظر ڈالتے ہیں تو اس سے ہم کو ایک ایسا تشفی بخش جواب ملتا ہے جو دنیا کی کسی دوسری کتاب اور دنیا کے کسی انسانی علم و فن سے نہیں ملتا۔

مخلوقات میں انسان کی امتیازی حیثیت

قرآن ہمیں خبر دیتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے دنیا میں مخلوقات کی جتنی انواع موجود تھیں وہ سب اپنی فطرت کے لحاظ سے اطاعت کیش واقع ہوئی تھیں[1] اختیار اور ارادہ کی قوت سرے سے ان کو دی ہی نہیں گئی تھی۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ جس کے سپرد جو خدمت کر دی گئی اس کو وہ ایک قانون اور ایک نظام کے مطابق ذرہ برابر سرکشی کیے بغیر بجا لاتا رہے۔ ان میں سب سے افضل مخلوق فرشتے تھے جن کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (التحریم: ۶)

"جو کچھ اللہ ان کو حکم دیتا ہے اس کی وہ نافرمانی نہیں کرتے ہیں اور جو ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔"

اسی طرح اجرامِ فلکی کی عظیم الشان ہستیاں تھیں، جن کا حال یہ تھا:

---

[1] اس کلیہ سے صرف جن مستثنیٰ ہیں جن کا مسئلہ یہاں زیرِ بحث نہیں ہے قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کی زندگی میں بھی جبر و اختیار کی آمیزش ہے اور ان کے اعمال کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں وہ مختار اور جواب دہ ہیں، لیکن بہر حال وہ ان خصوصیات کے حامل نہیں ہیں جن کی بنا پر انسان کو زمین کی خلافت دی گئی ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ حَتَّىٰ عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ (یٰسین: ۳۸ تا ۴۰)

"سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے یہ ایک زبردست صاحب علم کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے اور چاند کی منزلیں ہم نے مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی پہلی ہی کی طرف پلٹ آتا ہے۔ نہ سورج کی یہ مجال کہ چاند کو جا پکڑے نہ رات کی یہ مجال کہ ان سے پہلے آ جائے۔ سب ایک فلک میں تیر رہے ہیں"

یہی حال آسمان و زمین کی دوسری مخلوقات کا تھا کہ:

كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ (الروم - ۲۶)

"سب اس کے تابع فرمان ہیں"

لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَلَا يَسْتَحْسِرُونَ ۝ يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ ۝ (الانبیاء - ۱۹، ۲۰)

"اپنے رب کی بندگی سے نہ سرکشی کرتے ہیں، نہ تھکتے ہیں، شب و روز جاری میں دوڑ رہے ہیں، ذرا دم نہیں لیتے"

پھر اللہ نے چاہا کہ اپنی بنائی ہوئی مخلوقات میں سے کسی کو اپنی وہ امانت سپرد کر دے جو اس وقت تک کسی کو نہ دی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے وہ امانت آسمان اور زمین کی مخلوقات میں سے ایک ایک کے سامنے پیش کی اور ہر ایک نے زبانِ حال سے اپنی ناقابلیت اور اپنے عدم تحمل کا اقرار کیا۔ آخرکار اللہ نے اپنی تخلیق

کا جدید ترین ایڈیشن نکالا جس کا نام انسان ہے اور اس نے بڑھ کر وہ بار امانت اٹھا لیا جس کے اٹھانے کی صلاحیت اور ہمت کسی مخلوق میں نہ تھی۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (الاحزاب-۷۲)

"ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے آگے پیش کیا مگر انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اٹھالیا۔ یقیناً وہ اپنے اوپر ظلم کرنے والا اور نادان ہے (کہ اتنا بڑا بار امانت اٹھا کر اس کی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا)"

یہ امانت کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ کی صفات علم، قدرت، اختیار، ارادہ، اور فرماں روائی کا پرتو جو اس وقت تک کسی مخلوق پر نہ ڈالا گیا تھا جس کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ فرشتوں میں تھی نہ اجرام فلکی، نہ پہاڑوں میں، نہ دنیا کی کسی مخلوق میں۔ وہ صرف انسان تھا جو اپنی فطرت کے لحاظ سے اس پرتو کا متحمل ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے یہ بار امانت اٹھا لیا اور اسی لیے وہ اللہ کی خلافت و نیابت کے منصب پر سرفراز ہوا۔ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (بقرہ-۳۰)

اس بار امانت کے حامل اس خلیفۃ اللہ فی الارض کی امتیازی خصوصیت جس کی بنا پر یہ دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز ہو گیا ہے یہ ہے کہ وہ طبعاً اطاعت کیش نہیں بنایا گیا ہے[1]۔ اس کو عام مخلوقات کی طرح نظام کلی کے تحت قوانین و

---

[1] یہ بات متعدد آیات قرآنی سے ثابت ہوتی ہے مثلاً وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا (یونس-۹۹)۔ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا (انعام-۱۰۷) وغیرہ

حدودِ الٰہی کا پابند بنانے کے ساتھ ایک ایسی قوت بھی عطا کی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بخلاف دوسری مخلوقات کے ایک خاص دائرہ میں مجبورانہ اطاعت سے آزاد ہے اور اتنا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے اطاعت کرے اور چاہے سرکشی و نافرمانی کرنے لگے۔ یہ ایسا فرق ہے جو کلامِ الٰہی میں تدبر کرنے والے کو صاف نظر آتا ہے قرآن مجید میں آپ کو انسان کے سوا کسی اور ایسی مخلوق کا نشان نہ ملے گا جس کی طرف اطاعت اور عصیان، فرمانبرداری اور نافرمانی، حدود اللہ کی پابندی اور ان حدود سے تجاوز، دونوں کو نسبت دی گئی ہو، اور جس کی اطاعت پر جزا اور عصیان پر سزا کے مترتب ہونے کا ذکر کیا گیا ہو۔ وہ انسان ہی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ:

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (البقرہ ۲۲۹)

"جو لوگ اللہ کے حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں"

وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ (الاعراف۔ ۷۷)

"انہوں نے اپنے رب کے حکم سے سرکشی کی"

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (النساء۔ ۶۰)

"چاہتے ہیں کہ طاغوت کے پاس اپنا مقدمہ لے جائیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اس سے کفر کریں"

مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (الاعراف۔ ۶۰)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا خود یہ نہیں چاہتا تھا کہ انسان کو زبردستی شرک سے روکے اور ایمان پر مجبور کرے۔

"انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے والے تھے"

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ص (النساء ۱۳-۱۴)

"اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے حدود سے تجاوز کرے گا اسے اللہ دوزخ میں داخل کریگا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔"

یہ اور ایسی ہی بے شمار آیات ظاہر کرتی ہیں کہ انسان میں بخلاف دوسری تمام مخلوقات کے ایک ایسی قوت موجود ہے جس سے وہ اطاعت اور سرکشی دونوں پر قدرت رکھتا ہے اور اسی قوت کے صحیح یا غلط استعمال سے فلاح یا خسران، ثواب یا عتاب، انعام یا غضب کا مستحق ہوتا ہے۔

ہدایت و ضلالت

قرآن اس مسئلہ کو اور زیادہ کھول کر بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا

نے انسان کی فطرت میں بھلے اور بُرے دونوں کی تمیز ودیعت فرما دی ہے۔

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس۔ ۸)

اس کو فجور اور تقویٰ دونوں کا الہامی علم دیا۔

اس کو نیکی اور بدی دونوں کے راستے بتا دیئے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد ۱۰)

"ہم نے اسے دو نو راستے دکھا دیئے۔"

پھر اس کو اختیار دے دیا کہ جس راہ کو چاہے اختیار کرے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (الدہر۔ ۲۹)

جو چاہے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف ۲۹)

"جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔"

ایک طرف اس کو بہکانے کے لیے اس کا ازلی دشمن شیطان موجود ہے جو بدی کی راہ کو مزین کر کے اسے دکھاتا اور اس کی طرف رغبت دلاتا ہے۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ (الحجر۔ ۳۹)

"ابلیس نے کہا: اے رب تو نے جو مجھے گمراہ کیا تو اب میں بھی ان کے لیے زمین میں خوشنمائیاں دکھاؤں گا اور سب کو بہکاؤں گا۔"

اور دوسری طرف اللہ کی جانب سے رسول بھیجے جاتے ہیں، کتابیں نازل کی جاتی ہیں تاکہ انسان کو نیکی کا سیدھا راستہ بدی کی راہ سے ممتاز کر کے دکھائیں۔

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ

(فاطر - ۲۵)

"ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی دکھانے والی کتاب لائے۔"

اس طرح انسان کے اندر اور اس کے گرد و پیش مختلف قوتیں ہیں جن میں سے کوئی اس کو بدی کی طرف کھینچنے والی ہے اور کوئی نیکی کی طرف۔ ان قوتوں کے درمیان موازنہ کرنے کے لیے اس کو سمجھ بوجھ دی گئی ہے۔ اپنی راہ آپ دیکھنے کے لیے آنکھیں دی گئی ہیں اور اتنی قدرت دی گئی ہے کہ وہ جس راہ کو پسند کرے اس پر چل سکے۔ اگر وہ بدی کی راہ کو اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کی تمام طبیعی قوتوں اور ان خارجی اسباب کو جو اس کے نصیب میں لکھ دیئے گئے ہیں اس کا تابع فرمان بنا دیتا ہے اور یہ راہ اس کے لیے آسان کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر وہ نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ راہ بھی اس کے لیے آسان کر دی جاتی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى
وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى

(اللیل ۵-۱۰)

"پس جس نے راہ خدا میں مال دیا اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کیا اور نیکی کی تصدیق کی اس کے لیے ہم سہل راستہ میسّر کر دیں گے اور جس نے بخل کیا اور استغنا برتا اور نیکی کو جھٹلایا اس کے لیے ہم تنگی کی راہ میسّر کر دیں گے۔"

جو شخص گمراہی اختیار کرتا ہے اس کے ضمیر میں ایک الٰہی قوت پھر بھی موجود رہتی

ہے جو اس کو راہ راست کی طرف دعوت دیتی رہتی ہے مگر جب وہ اپنی کجروی پر اصرار کرتا ہے تو یہ قوت کمزور ہوتی چلی جاتی ہے اور ضلالت کی بیماری بڑھتی جاتی ہے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (البقرہ - ۱۰)

ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے پھر اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا

یہاں تک کہ ایک وقت آتا ہے جب اس قوت کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اور اس کے دل، آنکھوں اور کانوں پر ایسی مہر لگ جاتی ہے کہ وہ حق بات کو سمجھ نہیں سکتا، حق کی روشنی کا ادراک نہیں کر سکتا، حق کی آواز سن نہیں سکتا اور ہدایت کے تمام راستے اس کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (البقرہ - ۷)

مگر اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ انسان کا اختیار اور اس کی آزادی غیر محدود ہے اور اس کو کلیتہً وہ اختیارات تفویض کر دیے گئے ہیں جو قدریہ نے فرض کر لیے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ انسان کو جو کچھ اختیار دیا گیا ہے وہ یقیناً ان قوانین کے ماتحت ہے جو اللہ نے تدبیر کلی اور تدابیر جزئیہ کے لیے مقرر کر رکھے ہیں اور جن کے تحت یہ سارا کارخانۂ قدرت چل رہا ہے۔ کائنات کے نظام میں انسان کی قدرت اور اس کی روحانی، نفسانی اور جسمانی قوتوں کے لیے جو حدیں اللہ نے قائم کر دی ہیں ان سے وہ ایک بال برابر بھی تجاوز کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ پس یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ:

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر - ۴۹)

"ہم نے جو چیز بھی پیدا کی ہے ایک اندازے پر پیدا کی ہے"

إِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ أَمْرِهِ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (الطلاق ۳)

"اللہ اپنے کام کو پورا کر کے رہتا ہے اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا ہے"

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ (انعام - ۱۸)

"اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے"

عدل اور جزا و سزا

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ حقیقی عدل کرنے والا بجز خدا کے اور کوئی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ وہ حدود جن کے دائرے میں انسان کو اختیار حاصل ہے۔ خدا کی ہی قائم کی ہوئی ہیں اور خدا ہی اس حقیقت کا جاننے والا ہے کہ انسان کے اعمال میں اس کے اپنے اختیار کا حصہ کتنا ہے۔ اس نے جن حدود سے انسان کے اختیار کو محدود کیا ہے۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں: ایک قسم کے حدود وہ ہیں جو تمام نوع بشری کے لیے من حیث المجموع قائم کئے گئے ہیں اور دوسری قسم کے حدود وہ ہیں جو ہر شخص کے لیے فرداً فرداً مختلف طور پر مقرر ہیں۔ پہلی قسم کے حدود نوعی حیثیت سے تمام اولاد آدم کے اختیار کو محدود کر دیتے ہیں اور دوسری قسم کے حدود ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ اس لیے ان کے اعتبار سے ہر شخص کی زندگی میں اس کے اختیار اور اس کی مجبوری کی مقداریں جدا

جدا ہیں۔ اپنے اعمال کے لیے انسان کا ذمہ دار ہونا اور اس کی ذمہ داری کے لحاظ سے جزا و سزا کا مترتب ہونا اسی مقدار پر موقوف ہے جس کو ہر شخص نے اپنے افعال میں استعمال کیا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کو تولنا، جانچنا اور ایسا ٹھیک حساب لگانا کہ ایک ذرہ بھر بھی کمی بیشی نہ ہو، دنیا کے کسی جج اور کسی مجسٹریٹ کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ محاسبہ و موازنہ صرف فاطر السموٰت والارض ہی کر سکتا ہے اور وہی قیامت کے دن اپنی عدالت کا اجلاس کریگا۔ یہی بات ہے جس کی طرف کلام اللہ میں جگہ جگہ اشارہ کیا گیا ہے:۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذٍ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوا بِآيَاتِنَا يَظْلِمُونَ (اعراف۔ ۸، ۹)

"اس روز وزن بالکل ٹھیک ہوگا، جن کے اعمال خیر کے پلڑے بھاری ہوں گے وہی فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہی وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے ہماری آیات کے ساتھ ظلم کر کے اپنے آپ کو خود نقصان پہنچایا ہے"

إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ (غاشیہ: ۲۵، ۲۶)

ان کو ہماری ہی طرف آنا ہے اور ان کا حساب ہمارے ہی ذمہ ہے

وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ (زلزال۔ ۷، ۸)

جو ذرہ برابر نیک عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھ لے گا اور جو ذرہ

برابر بُرا عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ دیکھ لے گا۔"

قرآن مجید سے مسئلہ جبر و قدر پر بس اسی حد تک روشنی پڑتی ہے اور اس سے وہ گتھیاں سلجھ جاتی ہیں جو علم طبیعیہ اور علم الاخلاق کے مباحث میں بیان کی گئی ہیں۔ رہے وہ مابعد الطبیعی مسائل جن میں فلاسفہ اور متکلمین الجھے ہوئے ہیں یعنی یہ کہ اللہ کے علم اور اس کی معلومات، اس کی قدرت اور اس کے مقدورات، اس کے ارادہ اور اس کے مرادات میں کس نوع کا تعلق ہے، اور اس کے علم سابق، ارادۂ ازلی اور قدرت مطلقہ کے ہوتے ہوئے انسان کس طرح با اختیار اور اپنے ارادے میں آزاد ہو سکتا ہے، تو ان مسائل سے قرآن نے کوئی بحث نہیں کی، اس لیے کہ انسان ان کو سمجھ نہیں سکتا۔

جبر و قدر

(ایک تقریر جو ۲۳ اکتوبر ۴۲ء کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی ــــــ)

(باجازت آل انڈیا ریڈیو)

کیا ہماری تقدیر پہلے سے مقرر ہے؟ کیا ہماری کامیابی اور ناکامی، ہمارا گرنا اور ابھرنا، ہمارا بگڑنا اور سدھرنا، ہماری راحت اور تکلیف اور وہ سب کچھ جو ہمارے سامنے اس دنیا میں پیش آتا ہے کسی اور طاقت یا طاقتوں کے فیصلہ کا نتیجہ ہے جس کے متعین کرنے میں ہمارا کوئی حصہ نہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو کیا ہم بالکل مجبور ہیں؟ کیا ہم اس دنیا میں محض کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں جنہیں کوئی اور نچا رہا ہے؟ کیا ہم کسی بنی بنائی سکیم کو عمل میں لانے کے لیے بس ایک آلہ کے طور پر استعمال کیئے جا رہے ہیں گویا کہ ہم دنیا کے اسٹیج پر ان ایکٹروں کی طرح ہیں جن میں سے ہر ایک کا کام پہلے سے کسی نے مقرر کر دیا ہو؟

یہ سوالات ہمیشہ ہر اس شخص کے دل میں کھٹکتے رہے ہیں جس نے کبھی دنیا اور انسان کے متعلق کچھ غور کیا ہے فلسفی، سائنس دان، مؤرخ، محقق، سماج اور اخلاق اور مذہب کے مسائل سے بحث کرنے والے اور عام لوگ سبھی کو اس گتھی سے اپنا دماغ لڑانا پڑا ہے۔ کیونکہ ہر ایک کی گاڑی یہاں آکر اٹک جاتی

ہے اور آگے نہیں چلتی جب تک کہ اس کا کوئی نہ کوئی قابلِ اطمینان حل نہ مل جائے۔ چاہے وہ بجائے خود صحیح حل ہو یا غلط۔

محض ایک سادہ سی "ہاں" یا "نہیں" میں آپ ان سوالات کا جواب دینا چاہیں تو دے لیجئے۔ ممکن ہے کہ اس جواب سے آپ کا دل مطمئن ہو جائے، مگر خواہ آپ "ہاں" کہیں یا "نہیں" دونوں صورتوں میں بےشمار دوسرے سوالات پیدا ہو جاتے ہیں جن کا جواب دینا آپ کے ہاں اور نہیں دونوں کے بس کا کام نہیں ہے۔

آپ "ہاں" کہتے ہیں تو پھر ساتھ ہی آپ کو یہ بھی مان لینا چاہیئے کہ پتھر، لوہے، درخت، جانور اور انسان میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔ سب کی طرح انسان بھی وہی کچھ کر رہا ہے جو اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اختیار نہ اُن کو حاصل ہے نہ اس کو۔ شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا اور انسان کا ریلوے لائن بنانا دونوں میں چاہے درجہ کا فرق ہو مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں، کیوں کہ اس سے چھتہ اور ریلوے لائن کوئی اور ہی بنوا رہا ہے۔ ایجاد کے شرف سے دونوں محروم ہیں۔ اس کے بعد آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح انسان بھی اپنے افعال کا ذمہ دار نہیں ہے۔ ایک آدمی کا نیک کام کرنا اور ایک موٹر کا درست چلنا، دونوں یکساں ہیں۔ کسی آدمی کا جرم یا شرارت کرنا اور کسی سینے والی مشین کا خراب بخیہ کرنا دونوں کی ایک حیثیت ہے اور جب معاملہ یہ ہے تو جس طرح آپ "نیک موٹر"، "شریر مشین"، "ایماندار انجن"، "بدمعاش چرخہ" نہیں بولتے اسی طرح آپ کو آدمی کے لیے بھی نیک اور بد، شریر اور شریف، ایماندار اور بے ایمان اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ نہیں بولنے چاہئیں، یا اگر آپ بولتے ہی ہیں تو کیونکہ جو کچھ

آپ سے بلوایا جارہا ہے وہ بولنے پر آپ مجبور ہیں، تو کم از کم اتنا تو سمجھ ہی لینا چاہیئے کہ یہ الفاظ ہیں بے معنی۔

پھر بات اسی پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ہمارا مذہب اور اخلاق، یہ ہمارا قانون اور عدالتوں کا نظام، یہ ہماری پولیس اور جیل اور تفتیش جرائم کے محکمے، یہ ہمارے مدرسے اور تربیت گاہیں اور اصلاحی ادارے سب کے سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ کام یہ سب ہوتے رہیں گے، بند ان میں سے کوئی بھی نہیں ہوگا کیونکہ آپ کے نظریہ کے مطابق ان سب ایکٹروں کو دنیا کے اسٹیج پر اپنا اپنا مقررہ پارٹ ادا کرنا ہی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ جب مسجدوں کے نمازی اور مندروں کے پجاری، عدالتوں کے جج اور چوری اور ڈکیتی کے مجرم سب کے سب محض ایکٹر بن کر رہ جائیں اور عبادت گاہوں سے لیکر جوئے خانوں اور قید خانوں تک سب کے سب ایک بڑے ناٹک کے مختلف منظر قرار پائیں تو اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان کی پوری مذہبی اور اخلاقی زندگی محض ایک کھیل اور تماشا ہے۔ وہ شخص جو رات کی تنہائی میں خلوص سے پوجا اور عبادت کر رہا ہے، اور وہ جو کسی کے گھر میں نقب لگا رہا ہے۔ دونوں اس تماشے میں بس وہ پارٹ ادا کر رہے ہیں جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ ان کے درمیان کوئی فرق اس کے سوا نہیں کہ ڈائرکٹر نے ایک کو عابد و زاہد کا پارٹ دیا ہے اور دوسرے کو چور کا۔ ہماری عدالت میں جج صاحب خواہ کتنی ہی سنجیدگی کے ساتھ مقدمہ کی سماعت فرما رہے ہوں اور اپنی دانست میں مقدمہ کو سمجھ کر انصاف کرنے کی کیسی ہی کوشش کر رہے ہوں، مگر آپ کے اس نظریہ کی رُو سے وہ اور مستغیث اور ملزم

سب ننھے ایکٹر ہیں اور بیچارے اس دھوکہ میں پڑے ہوتے ہیں کہ کر رہے ہیں ڈراما اور
سمجھ رہے ہیں کہ عدالت کے کمرے میں واقعی عدالت ہو رہی ہے۔ یہ انجام ہے اس
'ہاں' کا جو آپ نے سرسری طور پہ میرے ابتدائی سوالات کے جوابات میں کر دی تھی۔
اچھا تو کیا پھر آپ ان سوالات کا جواب 'نہیں' کی صورت میں دینگے؟ مگر
مشکل یہ ہے کہ اس صورت میں بھی معاملہ ایک "نہیں" پر ختم نہ ہو جائے گا بلکہ اسکے ساتھ
آپ کو بہت سی صریح حقیقتوں کا انکار کرنا ہوگا جب آپ یہ کہتے ہیں کہ انسان کی تقدیر
پہلے سے مقرر نہیں ہے اور یہ کہ اس کی تقدیر کسی بیرونی قوت کے فیصلہ سے نہیں بنتی
تو غالباً آپکے اس انکار کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ مقرر کرتا ہے یعنی
اس کی تقدیر اس کے اپنے ارادے اور کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس پر پہلا سوال یہ
پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے اس بیان میں لفظ "انسان" سے کیا مراد ہے؟ فرداً فرداً
ایک آدمی؟ یا انسانوں کا ایک بڑا گروہ جسے سماج یا سوسائٹی یا قوم کہا جاتا ہے؟ یا پوری
نوعِ انسانی؟ اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے تو ذرا ان
چیزوں پر ایک نگاہ ڈال لیجئے جن سے تقدیر بنتی ہے پھر فرمائیے کہ آدمی ان میں سے کس
کس پر قابو رکھتا ہے۔ تقدیر بنانے کا پہلا سامان آدمی کے اعضاء اور اس کی ذہنی اور
جسمانی قوتیں اور اس کے اخلاقی اوصاف ہیں۔ جن کی درستی اور خرابی، توازن اور عدم توازن،
کمی اور بیشی کا فیصلہ کن اثر اس کی تقدیر پر پڑتا ہے مگر یہ ساری چیزیں ہر انسان ماں کے
پیٹ سے لے کر آتا ہے اور آج تک کوئی ایک آدمی ایسا پیدا نہیں ہوا ہے جو خود اپنی
تجویز اور اپنے انتخاب کے مطابق اپنے آپ کو بنا کر لایا ہو۔ پھر آدمی کی تقدیر کے بننے اور
بگڑنے میں ان بہت سے اثرات کا دخل ہوتا ہے جو ہر انسان کو وراثت میں اپنے

آباؤاجداد سے ملتے ہیں پھر جس خاندان، جس سوسائٹی، جس طبقے، جس قوم اور جس ملک میں وہ پیدا ہوتا ہے، اس کی ذہنی، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی حالت کے بیشمار اثرات دنیا میں قدم رکھتے ہی اس پر چھا جاتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں آدمی کی تقدیر بنانے میں حصہ لیتی ہیں مگر کیا کوئی شخص ایسا ہے جس نے اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے اس نسل اور اس ماحول کا تعین کیا ہے جس میں اُسے پیدا ہونا ہے اور خود یہ فیصلہ کیا ہو کہ وہ ان میں سے کس کس کے کیا اثرات قبول کرے؟ اسی طرح آدمی کی تقدیر پر دنیا کے بہت سے واقعات اور اتفاقات کے بھی اچھے اور بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ زلزلے سیلاب، قحط، موسم، بیماریاں، لڑائیاں، معاشی اتار چڑھاؤ اور اتفاقی حادثے اکثر انسان کی پوری زندگی کا رُخ بدل دیتے ہیں اور اس کے ان سارے نقشوں کو درہم برہم کر ڈالتے ہیں جو اس نے بڑے سوچ بچار اور بڑی کوششوں سے اپنی راحت اور اپنی کامیابی کے لئے بنائے ہوتے ہیں اور اس کے برعکس بارہا یہی اتفاقات اچانک ایک انسان کو ایسی کامیابیوں تک پہنچا دیتے ہیں جن کے حصول میں فی الواقع اس کی اپنی کوشش کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ یہ ایسی نمایاں حقیقتیں ہیں جن سے انکار کرنے کے لیے ہٹ دھرمی کی ضرورت ہے۔ آخر یہ کیسے مان لیا جائے کہ آدمی اپنی تقدیر آپ بناتا ہے؟

اب اگر آپ اپنے دعوے میں ترمیم کر کے یہ کہتے ہیں کہ افراد نہیں بلکہ قومیں اپنی تقدیر بناتی ہیں تو یہ بھی ماننے کے قابل بات نہیں۔ ہر قوم کی تقدیر جن اسباب سے بنتی ہے ان میں نسلی خصوصیات، تاریخی اثرات، جغرافیائی حالات، قدرتی مسائل اور بین الاقوامی صورتِ حال کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور یہ بات دنیا کی کسی قوم کے بس میں نہیں ہے کہ وہ ان اسباب کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔ پھر وہ قانون

قدرت جس کے تحت زمین و آسمان کا انتظام ہو رہا ہے اور جس میں دخل دینا تو درکنار
اسے پوری طرح جان لینا بھی کسی قوم کے بس کا کام نہیں ہے، اس طرح قوموں کی تقدیر
پر اثر ڈالتا ہے کہ اس کو روکنے یا اس سے بچنے کی طاقت کسی قوم کو حاصل نہیں۔ یہ قانون
پس پردہ اپنا کام کرتا رہتا ہے اور کبھی اچانک اور کبھی بتدریج اس کے عمل سے ایسے نتائج
رونما ہوتے ہیں جو ابھرتی ہوئی قوموں کو گرا دیتے اور گرتی ہوئی قوموں کو ابھار دیتے ہیں خیر یہ
تو وہ اسباب ہیں جو صریح طور پر انسانی دانست سے باہر ہیں مگر جو اسباب بظاہر انسان
کی دسترس میں ہیں، ان کا تفصیلی جائزہ بھی کچھ امید افزا نہیں ہے ایک قوم کی تقدیر بننے
کا بہت کچھ انحصار اس پر ہے کہ اسے مناسب رہنمائی (لیڈرشپ) میسر آئے اور اس کے
افراد کی ایک اچھی خاصی تعداد میں وہ صفات اور وہ خصوصیات موجود ہوں جو اس رہنمائی
سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہیں مگر تاریخ سے ہم کو ایسی کوئی شہادت نہیں
ملتی اور نہ اپنے زمانہ کے مشاہدات میں ہم ایسی کوئی نظیر پاتے ہیں کہ کسی قوم نے ان
دونوں چیزوں کے حاصل کرنے میں آزادی کے ساتھ خود اپنے ارادے اور انتخاب سے
کام لیا ہو۔ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب ایک قوم کے ابھرنے کا وقت آتا ہے تو اس کو
اچھی رہنمائی بھی میسر آتی ہے اور اس میں وہ خصوصیات بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو اس
رہنمائی کی کامیابی کے لیے مطلوب ہیں اور وہی قوم جب گرنے لگتی ہے تو رہنمائی اور
پیروی دونوں کی قابلیتیں اس سے اس طرح رخصت ہو جاتی ہیں کہ اس کا کوئی
دردمند بھی خواہ انہیں واپس نہیں لا سکتا۔ ہمیں کچھ خبر نہیں کہ وہ کونسا قانون ہے جس کے
تحت تاریخ اقوام کے یہ نشیب و فراز واقع ہوتے ہیں۔

پھر کیا قوموں کو چھوڑ کر آپ پوری نوع انسانی کے متعلق یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ وہ

اپنی تقدیر آپ بناتی ہے، مگر یہ کہنا اور زیادہ مشکل ہے نسلوں اور قوموں میں بٹی ہوئی، ملکوں میں پھیلی ہوئی، بے شمار مختلف تمدنوں اور تہذیبوں میں رنگی ہوئی اور لاتعداد زبانیں بولنے والی نوع کے متعلق اگر کوئی شخص یہ فرض کرتا ہے کہ اس کا ایک مجموعی ارادہ ہے جس کے مطابق وہ سوچ سمجھ کر اپنی تقدیر متعین کرتی ہے تو حقیقت میں وہ ایک بڑی عجیب بات فرض کرتا ہے۔ کیا واقعی اس نوع نے اپنی رفتار ترقی کے لیے یہ ٹائم ٹیبل خود تجویز کیا تھا کہ فلاں دور تک یہ پتھر کے اوزاروں سے کام لے گی پھر لوہے اور آگ کو استعمال کرنا شروع کرے گی فلاں عہد تک انسانی اور حیوانی طاقت سے کام کرتی رہے گی، پھر مشین کی طاقت استعمال کرنے لگے گی؟ فلاں صدی تک کمپاس کے بغیر کشتیاں چلائے گی پھر اپنی سمت سفر متعین کرنے میں کمپاس سے کام لے گی؟ پھر کیا وہ نوع انسانی ہی ہے جس نے افریقہ، امریکہ، یورپ، ایشیا اور آسٹریلیا کی مختلف قوموں یعنی خود اپنے مختلف حصوں کے لئے مختلف تقدیریں متعین کی ہیں؟ ظاہر ہے کہ ایسے عجیب وغریب دعوے کرنے کا خیال بھی کوئی ہوشمند آدمی نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد آپ کے لیے اپنی اس رائے پر قائم رہنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی کہ انسان اپنی تقدیر آپ بناتا ہے کیونکہ جب نہ ہر فرد اپنی تقدیر کا مالک ہے نہ افراد کا کوئی مجموعہ، نہ پوری نوع، تو یہ تقدیر کی ملکیت آخر کس "انسان" کے حصہ میں آئے گی؟

آپ نے دیکھا، وہ سوالات جو میں نے ابتدا میں آپ کے سامنے پیش کئے تھے ان کا جواب نہ محض "ہاں" کی صورت میں دیا جا سکتا ہے اور نہ محض "نہیں" کی صورت میں۔ حقیقت ان دونوں کے درمیان ہے جو زبردست ارادہ کائنات کے اس

نظام کو چلا رہا ہے۔ اس سے آزاد ہو کر کوئی چیز دنیا میں کام نہیں کر سکتی بلکہ کام کرنا تو کیا جی بھی نہیں سکتی۔ ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جو پوری قوت کے ساتھ زمین و آسمان میں چل رہی ہے کسی میں اتنا بل بوتا نہیں ہے کہ اس اسکیم کے خلاف چل سکے یا اس کو بدل سکے یا اس پر کوئی اثر ڈال سکے۔ ہمارے جتنے علوم، جتنے تجربات، جتنے مشاہدات ہیں، سب کے سب اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ کائنات کی اس سلطنت میں کسی کی خود مختاری کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آسمان کے بڑے بڑے کروں کو جس نظام کے بندش اپنے مقرر کردہ راستے سے بال برابر جنبش نہیں کرنے دیتی، زمین کو جس طاقت نے ایک ضابطے کے مطابق گردش کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ ہوا اور پانی اور روشنی اور گرمی و سردی پر جس حکومت کا مکمل اقتدار ہے انسان کی پیدائش سے پہلے جس قوت نے وہ اسباب فراہم کئے ہیں جن سے اس زمین پر انسان کا موجود ہونا ممکن ہوا اور جس قوت کے اختیارات کا یہ حال ہے کہ اسبابِ زندگی کے توازن میں تھوڑا سا رد و بدل بھی کر دے تو ہماری نوع آن کی آن میں فنا کے گھاٹ اتر سکتی ہے۔ اس کے ماتحت رہتے ہوئے انسان کے لیے ایسی آزادی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اپنی تقدیر جیسی چاہے خود بنا لے۔ مگر یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ طاقت جو ہمیں اس دنیا میں لائی ہے، جس نے ہم کو علم، غور و فکر، ارادہ اور فیصلے کی توفیق دی ہیں، جس نے ہم میں یہ احساس پیدا کیا ہے کہ ہم کچھ اختیار رکھتے ہیں، جس نے ہم نے یہ صلاحیت پیدا کی ہے، کہ ہم نیک و بد میں امتیاز کرتے ہیں۔ اخلاقی اور غیر اخلاقی افعال میں فرق کرتے ہیں اور دنیا کے معاملات میں ایک طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں اور دوسرا طرزِ عمل ترک کرتے ہیں، اس نے یہ سب کچھ ہمارے ساتھ محض مذاق کے طور پر

کیا ہے۔ ہمیں اس کائنات کی تدبیر و انتظام میں انتہا درجہ کی سنجیدگی نظر آتی ہے۔
مذاق اور کھیل اور مسخرہ کہیں نظر نہیں آتا۔ لہٰذا حقیقت وہی ہے جو وجدانی طور پر ہم میں
سے ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ یعنی فی الواقع ہم کو یہاں ایک محدود پیمانہ پر کچھ اختیارات
دیئے گئے ہیں اور ان اختیارات کے استعمال میں ہم مناسب حد تک آزاد بھی رکھے
گئے ہیں۔ یہ آزادی حاصل کی ہوئی نہیں ہے بلکہ دی ہوئی ہے۔ اس کی مقدار کتنی
ہے، اس کے حدود کیا ہیں اور اس کی نوعیت کیا ہے۔ اس کا تعین مشکل بلکہ ناممکن
ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ آزادی ہے ضرور۔ کائنات کی عالمگیر اسکیم
میں ہمارے لئے یہی جگہ تجویز کی گئی ہے کہ ہم ایک محدود پیمانہ پر آزادانہ کام کرنے والے
ایکٹر کا پارٹ ادا کریں۔ ہمارے لیے یہاں اتنی ہی آزادی ہے جتنی آزادی کی اس اسکیم میں
گنجائش ہے اور ہم اخلاقی حیثیت سے درحقیقت اسی قدر ذمہ دار ہیں جس قدر ہم کو آزادی
بخشی گئی ہے یہ دونوں امور کہ ہم کس قدر آزاد ہیں اور ہم پر اپنے افعال کی ذمہ داری کتنی ہے
ہمارے دائرہ علم سے باہر ہیں انکو وہی طاقت جان سکتی ہے جس نے اپنی اسکیم میں ہمارے لیے یہ مقام تجویز کیا ہے
یہ نظریہ ہے جو اس مسئلہ میں مذہب نے اختیار کیا ہے۔ مذہب ایک طرف قادر مطلق خدا پر
ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اور ہمارے گرد و پیش کی ساری
دنیا خدا کی محکوم ہے اور اس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے۔ دوسری طرف وہ ہم کو اخلاق کے
تصورات دیتا ہے، نیکی اور بدی میں فرق کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اگر ہم ایک راستہ
اختیار کریں گے تو ہمیں نجات حاصل ہوگی اور دوسرے راستہ پر چلیں گے تو ہم کو سزا دی جائیگی۔ یہ بات
صرف اسی صورت میں معقول ہو سکتی ہے کہ ہم واقعی اپنے اختیار سے اپنی زندگی کا راستہ منتخب کرنے میں آزاد ہوں